کھنکتی خاک

◎

پروفیسر احمد ساقی

......☆......

ISBN

978-969-9637-16-2

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	کھنکتی خاک
سرورق	غلام مصطفیٰ مغل
کمپوزنگ	شاہد لطیف چوہدری، 0300-6952580
سن اشاعت	جون 2014ء
قیمت	300 روپے
ناشر	ایسکام پبلشرز، اوکاڑا
تعداد	500

ایسکام پبلشرز

فیصل پلازہ، دیپالپور روڈ۔ اوکاڑا، موبائل:0300-6952580

انتساب

اپنی شریکِ رنج و راحت کے نام جس نے
ہمیشہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی

اِک بار پھر ملی تو بصد شوق و افتخار
ہم وہ بھی تیرے ساتھ گزاریں گے زندگی

ملنے کے پتے

۔۔۔۔ مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور

۔۔۔۔ الکریم نیوز ایجنسی، کچہری بازار، اوکاڑا

۔۔۔۔ ایسکام کمپیوٹرز، دیپالپور روڈ، سی بلاک، اوکاڑا

فہرست

باطن سے پھوٹتی سچائیوں کا اظہاریہ

غزل ہماری اردو شاعری کا ہارسنگھار ہے تمام تر مخالفتوں کے باوجود اس کے کہنے اور چاہنے والوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی۔تقریبا ہر شاعر (یہاں شاعر ہونا لازمی ہے) اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کرتا ہے۔آخر اس صنف میں ایسا کونسا جادو ہے جو سب کو اسیر کیسے رکھتا ہے۔شائد اس لیے کہ غزل کا کرافٹ ہی کچھ ایسا ہے یعنی دو مصرعوں کا ایک وزن میں ہونا، قافیے ردیف کی پابندی یہ سب غزل کے پیکر کو خوبصورت بنانے کے عمل کا حصہ ہے۔اور یہ ہی وہ اردو غزل کا حسن دِل نواز ہے جس کی گرفت میں آیا ہوا کم ہی کہیں اور جاتا ہے۔اور پھر یہ حسن اس وقت دو آتشہ ہو جاتا ہے جب دو مصرعوں میں بیان کیے جانے والا مضمون بھی اچھوتا ہو۔بلا شبہ وہ شعراء قابل داد بھی ہیں اور قابل رشک بھی جن کے ہاں مصرعوں کی بُنت بھی کمال کی ہو اور مضامین بھی اعلیٰ اور حیران کر دینے والے ہوں۔غزل تر و تازہ بھی اسی لیے ہے کہ اسے وقتاً فوقتاً ایسے شاعر میسر آتے رہے جو تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔خُدا کے فضل سے یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

انہی باکمال شاعروں میں ایک جناب احمد ساقی بھی ہیں۔احمد ساقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک ایسے مشاعرے میں ہوئی جہاں میں مہمان خصوصی کی نشست

پر براجماں تھا۔مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ اسٹیج سیکریٹری نے پروفیسر احمد ساقی کا نام پکارا۔تیکھے نین نقش اور مضبوط ڈیل ڈول رکھنے والی ایک باوقار شخصیت اسٹیج پر تشریف لائی تو سامعین کی کثیر تعداد نے بھرپور تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔انہوں نے اپنی غزل شروع کی۔جوں جوں اشعار میری سماعت میں اترتے گئے میں ایک خوشگوار حیرت میں ڈوبتا چلا گیا۔سامعین کی بھرپور فرمائش پر ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری غزل پیش کی۔انہوں نے مشاعرے میں خوب رنگ جمایا۔بلا شبہ انکی غزلیں عہدِ حاضر کی جدید تر اعلیٰ شاعری کے ہمراہ کھڑی تھیں۔یہ احمد ساقی اور ان کی شاعری سے میرا پہلا تعارف تھا۔میں انکی شخصیت اور شاعری دونوں کا گرویدہ ہو چکا تھا۔پھر گاہے بگاہے بذریعہ ٹیلی فون میں ان کے تازہ کلام سے فیض یاب ہوتا رہا۔ان کی غزلیں ہمیشہ مجھے سرشار کرتیں۔

ایک روز انہوں نے ذکر کیا کے وہ اپنا شعری مجموعہ شائع کر رہے ہیں اور اسکا دیباچہ مجھے تحریر کرنا ہے۔ان کی محبتیں اپنی جگہ لیکن میرے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ تھا شاید اس لیے بھی کہ میں اپنی تنقیدی بصیرت اور اہلیت سے بخوبی آگاہ تھا۔میں نے دبے دبے لفظوں میں معذرت بھی کی مگر انہوں نے اپنا مسودہ میرے سپرد کر دیا۔

شعر کہنا اور شعر کے صنائع اور بدائع پر گفتگو کرنا دو مختلف کام ہیں ڈرتے ڈرتے مسودے کا مطالعہ شروع کیا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انکی غزل کا مجموعی تاثر مجھے ایک نئے جہانِ معانی میں لے گیا۔جدید اردو غزل مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی آج جس بلند مقام پر موجود ہے ایک عمومی شاعر کے لیے اس مقام تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک اور بلند حوصلہ رکھنے والے شاعر

ہی اس مقام یااس سے آگے نکلنے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔

میرے خیال میں پروفیسر احمد ساقی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال بھی ہیں اوران میں یہ مرحلہ طے کرنے کا حوصلہ بھی ہے جس کی جھلک انکے پہلے شعری مجموعے ''کھنکتی خاک'' میں نمایاں نظر آرہی ہے۔انہوں نے اپنے اس مجموعے کے ذریعے اپنی شاعری کی بلندو بالا عمارت کے لیے ایک مضبوط بنیادفراہم کردی ہے۔جناب احمد ساقی کی غزل کاالاؤ ان کے وجود میں دہکتی آگ سے روشن ہوا ہے۔ان کی غزل کے جہانِ حیرت میں یہی الاؤ خام مٹی کو پختہ بھی کررہاہے اورزندگی کی تنگ وتاریک گلیوں میں روشنی بھی بکھیر رہاہے۔ان کی غزل ان کے باطن سے پھوٹتی سچائیوں کااظہاریہ ہے۔یوں بھی شاعری اس وقت پُرتاثیر ہوتی ہے جب وہ اپنے اندرون سے جنم لیتی ہو۔

جناب احمد ساقی نے جوبھی کہاہے اپنا کہاہے وہ عظمت انسان کی پاسداری کے شاعرہیں اوراسکااظہارانکی غزل کے پس منظر میں نمایانظرآتاہے۔

میرے ہونے کا مجھے پہلے یقین ہونے دے
پھر عدم کا تو مجھے تخت نشین ہونے دے
میں تیری ذات کا حصہ تونہیں ہوں پھر بھی
میرے مولا تو مجھے عرش نشیں ہونے دے

اپنے ہونے کایقین اور پھرعرش نشیں ہونے کی تمناعظمتِ انسان کی دلیل نہیں تو پھراورکیاہے؟ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان لایعنی حدودوقیود میں جکڑاہواہے اسے اگر نئے جہانوں کوتسخیر کرناہے تو پھر کہنہ روایات سے نکلنا ہوگا یہی ایک ذریعہ ہے جو اسے بلند مقام عطا کرسکتاہے۔

کائناتی وسعتوں سے آشنا ہونا ہے گر
پھر مری جاں زندگی کے سائباں سے تو نکل
روشنی میں دب گئی ہے تیری اپنی ذات بھی
اے مرے ننھے ستارے کہکشاں سے تو نکل

جناب احمد ساقی کے ہاں تصوف کے مضامین کی جلوہ گری بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔لیکن یہ تصوف خواجہ میر درد سے بہت مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔انہوں نے تصوف کو خدا، انسان اور کائنات کے مظاہر کے حوالے سے نئے اور منفرد پیرائے میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے اور اسے آج کی جیتی جاگتی زندگی کے ساتھ جوڑنے کی سعئ بلیغ کی ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیئے۔

میں زمیں سے آرہا ہوں آسماں سے تو نکل
اے مرے خاکی بدن اب درمیاں سے تو نکل

......

وہ جس مکان میں پہلے مکین رہتا تھا
اسی مکین میں اب وہ مکان رہتا ہے

......

کھنکتی خاک میں روکا گیا ہوں
اشارے تک یہاں ٹھہرا ہوا ہوں
ہزاروں حیرتیں زندہ ہیں مجھ میں
میں شیشہ گر کے گھر کا آئنہ ہوں

اسی طرح احساسِ فنا ان کے ہاں طرح طرح سے انسانوں کو خبردار کرتا ہے اور ذات باری کی لازوال حیثیت کو اجاگر کر کے اہل یقین ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بکھر جانا ہے
دوستو ہم کو کسی اور نگر جانا ہے

......

زندگی موت کنارے سے لگی رہتی ہے
اب تو ہر سانس پہ لگتا ہے کے ٹوٹا ٹوٹا

......

روح پرواز کو تیار کھڑی ہے
راہ میں جسم کی دیوار کھڑی ہے

اسی طرح ''انکار'' کا مضمون انکی شاعری میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تصوف کا مضمون ہوتے ہوئے بھی اپنی ایک جداگانہ اور انفرادی شان کے ساتھ جگہ جگہ ہمیں متوازن انداز میں نظر آتا ہے۔

میں ابھی خود کو بھی تسلیم نہیں ہوں
میرے اندر کئی انکار پڑے ہیں

......

کئی انکار ایسے بھی پڑے ہیں میرے سینے میں
جو کہتے ہیں ہمیں دستِ پیمبر سے نکلنا ہے

......

اب تو رسوائی درو بام پہ آگ آئی ہے
اے خدا ہم ترے انکار سے کب نکلیں گے

جدید شاعری دراصل جدید طرز احساس کی شاعری ہے۔عہدِ حاضر میں جو شعرا اپنی انفرادیت اور تازہ کاری کی بدولت نمایاں مقام کے حامل ہیں ان میں احمد ساقی صاحب بھی شامل ہیں۔ان کے ہاں ایک صحت مندانہ رویہ، یہ ہے کہ وہ روایت سے یکسر منکر نہیں ہیں۔بلکہ روایت اور جدت کے امتزاج سے شعر کو ثروت مند بناتے ہیں اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کون کہتا ہے کہ تصویریں ہوئی ہیں معدوم
اب وہ دیوار کے پیچھے ہیں جو دیوار پر تھیں

......

دھوپ میں اس لیے کھڑا ہوں میں
کوئی سایہ مری پناہ میں ہے

......

قلب و جاں سے کیے جاتے ہیں سبھی اشک کشید
کس اذیت سے گزرتا ہے یہ پانی مت پوچھ

......

کاش ایسی کوئی ترکیب میسر آئے
کارِ ہجرت تو رہے نقل مکانی نہ رہے

......

مری مٹی کا زمیں سے اس قدر ہو تال میل
میں فقط ایڑی لگاؤں یہ زمیں چلنے لگے

جناب احمد ساقی کا ایک اہم پہلو انکا مروجہ سسٹم میں رہتے ہوئے دوسرے شعرا سے مختلف ہونا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا انکا یہ عمل شعوری ہے یا غیر شعوری مگر ان کے ہاں ایک الگ فضا نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں ایک علیحدہ نقطہ نظر رکھنے والے انسان ہیں۔ لہذا انہوں نے پورے تیقن سے اپنے خیالات کو شعری جامہ پہنایا ہے۔

ایک با کمال شاعر اسی وقت کوئی کارنامہ سر انجام دے سکتا ہے جب وہ شاعروں کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اور جسے خداوند کریم نے بے پناہ تخلیقی جوہر سے نوازا ہو۔ میرے خیال میں جناب احمد ساقی ایک ایسے ہی شاعر ہیں۔ کھنکتی خاک جہانِ شعر میں ان کی پہلی صدائے بلند ہے جو سب کی سماعتوں کو متوجہ کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا آئندہ شعری سفر بھی اسی زور شور سے جاری رہے گا۔ میری تمام دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

قمر رضا شہزاد

دوست نواز باکمال مستعصم چودھری

مستعصم چودھری میرے بہترین دوستوں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔عرصہ 25 سال سے امریکہ میں مقیم ہونے کے باوجود اس نے رابطوں میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ہماری دوستی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ہوا پھر یہ بغیر کسی تعطل کے پروان چڑھتی رہی۔موصوف ان دوستوں میں سے ہے جو دوستی کے نام پر اپنی جان بھی داؤ پر لگانے کو تیار رہتے ہیں۔اکثر فون پر بات کرتے ہوئے میرے شعری مجموعہ کے اشاعت کے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ایک دن میں نے تنگ آ کر اسے کہا تم نے کونسی سپانسر شپ بھیجی ہوئی ہے؟ فون کٹ گیا میں سمجھا شاید میری بات بری لگی، آدھ گھنٹے بعد دوبارہ موبائل کی گھنٹی بجی، میں نے پوچھا، کیا بات ہوئی فون کاٹ دیا۔بولا، تمہاری کتاب کی سپانسر شپ کا بندوبست کر رہا تھا۔میں نے ہنستے ہوئے کہا، ادب نوازی کا بہت بہت شکریہ۔یار باش قہقہ لگاتے ہوئے بولا ''ساڈا شعر و ادب نال کی واسطہ سانوں تے یار دی یاری نال غرض اے''۔

مستعصم چودہری کے حوالے سے ایک واقعہ ہمیشہ میرے ذہن میں رہتا ہے جسے اس کی اجازت سے آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔مستعصم نڈر، بے باک شخصیت

اور رعب دار آواز کا مالک تھا، گلا صاف کرنا ہو تو سٹرپسلز کی بجائے بڑک لگانے کو ترجیح دیتا تھا۔ جارحانہ مزاج رکھنے والا سیدھا سادا ابا کسر، جسے صنفِ نازک سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ایسے لگتا تھا کہ مستعصم اور عشق دو متضاد جہتیں ہیں۔ مگر ایک دن یہ انہونی بھی ہو گئی اور مستعصم کسی حسینہ کے دامِ فریب کا شکار ہو گیا۔ اس کے لہجے کی سختی ملائمت میں ڈھلتی چلی گئی اسکی بڑکیں غائب ہو گئیں مگر محبت میں بھی اسکی جارحیت اور جلد بازی نہ گئی۔ بقول عدم۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

محبت کے مقابلے میں مستعصم مدّمقابل کو ناک آؤٹ تو نہ کرسکا مگر اس درد نے اسے شاعر بنا دیا۔ اس حسینہ کی بے وفائی کے چرچے مستعصم کی اس نظم کی وجہ سے پوری یونیورسٹی میں ہوئے جو اس نے ایک مشاعرے میں اپنی محبوبہ کی موجودگی میں پڑھی۔ اس کا ابتدائی حصہ مجھے اب بھی یاد ہے۔

رنگ برنگے کپڑوں والی
جس لڑکی کو میں نے چاہا
اس نے یوں اظہار کیا تھا
میں تیری ہو جاؤں گی پر
مجھ سے کچھ تو دور رہا کر
میں نے سوچا کیسی ہے یہ
پیار بھی مجھ سے کرتی ہے یہ

پھر کیوں مجھ سے ڈرتی ہے یہ

ظاہر ہے ایک باکسر کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی، اچھا ہی ہوا یہ بات اسے سمجھ نہیں آئی، پھر اسے ایک ایسی محبوبہ ملی جو بقول مستعصم بیوی بن کر بھی محبوبہ ہی رہی جس نے اسے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ یاد کے سب حوالوں کے ساتھ میں اپنے دوست مستعصم کی تمام محبتوں کا شکر گزار ہوں۔ اللہ پاک اسے دیارِ غیر میں بمع اہل وعیال خوش وخرم رکھے۔ آمین!

اظہار تشکر

خدائے بزرگ و برتر کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس شعری مجموعے کو شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی سے میں اس قابل ہوا کہ اس کاوش کو کتابی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ ان میں سے دو نام تو ایسے ہیں جن کی علمی اور ادبی خدمات کا زمانہ معترف ہے۔ اُردو شاعری کا اعتبار اور مان جناب ڈاکٹر خورشید رضوی جو عربی زبان و ادب کے محقق سکالر ہیں اور جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جنہوں نے اردو زبان کی تعلیم و ترویج کے لیے عمر صرف کر دی۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں منفرد حیثیت کے حامل اور خوبصورت شاعر ہیں۔ میں ان دونوں اکابرین کو اپنے اساتذہ میں شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے کمال مہربانی اور لطف و عنایت سے کام لیتے ہوئے نہ صرف میری شاعری کو سراہا بلکہ اسے شائع کرنے کی سند بھی عطا فرمائی۔ مزید دو نام ایسے ہیں جن کے بغیر جدید اردو شاعری کی پہچان مکمل نہیں ہوتی جناب عباس تابش اور جناب قمر رضا شہزاد۔ انہوں نے جس محبت سے میری شاعری پہ اپنی آراء قلم بند کی ہیں وہ میرے لیے باعث اعزاز ہیں۔ میں ان دونوں صاحبان کا خلوصِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر میں یہاں منفرد لہجے کے نوجوان شاعر پروفیسر کاشف مجید کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہو، جس کے اصرار پر شعری دنیا میں میری مراجعت ہوئی اور اس کی دیانتدارانہ مشاورت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

چند ادب نواز شخصیات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہوں جن کے تعاون سے اوکاڑا شہر کی شعری و ادبی سرگرمیاں سانس لیتی ہیں۔ جناب اکرم بھٹی ایڈووکیٹ، جناب چودہری ارشد اقبال مینجنگ ڈائریکٹر نعمت بناسپتی اوکاڑا، جناب چودہری شفقت رسول مینجنگ ڈائریکٹر BMA فارما اوکاڑا، جناب قاری خالد نذیر ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ ساہیوال، جناب ڈاکٹر اعظم چیئرمین (تہذیب)، جناب میجر عبدالغفار الشفیع جیولرز، جناب سلطان محمود گجر پراپرٹی ڈیلر۔ خاص طور پر پریس کلب اوکاڑا کے تاحیات چیئرمین جناب منیر چودہری کا ممنون ہوں جنہوں نے لٹریری سرکل (تہذیب) کے پلیٹ فارم سے اس کتاب کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں عزیزم غلام مصطفی مغل کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت سے اس کتاب کا ٹائٹل بنایا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اور ہمارے اہل خانہ کو خوش و خرم زندگی اور تندرستی عطا فرمائے۔ نیز دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔ آمین!

میرے اس شعری سفر میں بہت سے احباب شریک رہے جن کی آراء اور مشورے میرے لیے چراغِ راہ ثابت ہوئے ان میں سے جناب افضل خان، جناب سخنور نجمی اور جناب ندیم احسن قابلِ ذکر ہیں میں ان کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

عرضِ شاعر

ہم زندگی کو اپنے مشاہدات اور تجربات سے دائروں میں تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں اور انہیں ایک کسوٹی بنا کر اچھائیوں اور برائیوں کے مابین خطِ فاصل کھینچ لیتے ہیں۔ اِنہی خطوط کو مبلغ علم اور سرمایہ حیات سمجھ کر آئندہ نسلوں پر مسلّط کرنے کے درپئے رہتے ہیں۔ اس سارے عمل میں ہم بھول جاتے ہیں کہ ان حقائق کے پسِ پردہ ایک ''حقیقتِ اولیٰ'' (Absolute Reality) ہے جس نے اس جہان کی جیومیٹری تشکیل دی ہے اور کچھ ایسے دائرے کھینچ رکھے ہیں جو ہمارے تجربات اور مشاہدات کے کھنچے ہوئے خطوط سے کہیں اعلیٰ و برتر اور مستند ہیں۔ دراصل وہی قدرِ اولیٰ (Absolute Value) ہے جس کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یقیناً ہماری یہ سب سے بڑی غفلت ہے۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ پیش لفظ میں شعر و ادب کے حوالے سے عمومی روایت کے مطابق فلسفۂ شعر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنی شاعری کی حدود و قیود کا ذکر کروں مگر پھر سوچا کہ ''کھنکتی خاک'' میں جو شاعری صاحبانِ حلّ و نقد کے سامنے پیش کر رہا ہوں کیا وہ مرا آئینہ نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس رائیگاں سفر کا کیا فائدہ؟ البتہ شعر کے حوالے سے چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

ایک مقولہ ہے کہ ''افصح الکلام ماقلَّ و دَلَّ''، یعنی فصیح تر کلام وہ ہے جو معنوی اعتبار سے ثروت مند اور لفظی اعتبار سے مختصر ہو۔ اس معیار پر اگر کوئی کلام پورا اتر سکتا ہے تو وہ شعر ہے، علمائے شعر، شعر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''الشعر کلام'' موزون معنون''، یعنی شعر اس کلام کو کہتے ہیں جو وزن میں ہو اور بامعنی ہو۔ اگر کوئی صاحب ان

دونوں شرائط پر پورا اترتے ہوئے کچھ لکھتا ہے تو اسے شاعر کہا جاتا ہے۔رہی بات شعر کی عمدگی کی تو آفاقی خیالات کو عمدہ لفظی بندش (جسے آج کل کرافٹ کہا جاتا ہے) میں پرو دینے سے عمدہ شعر وجود میں آتا ہے۔یہ ہنر مندی اور سلیقہ کسی کا ذاتی کمال نہیں ہوتا بلکہ خدائے بزرگ و برتر کی عطا ہے اگر کسی کے پاس یہ ہنر ہے تو اسے سراپائے تشکّر ہونا چاہیے،کسی گھمنڈ اور غرور کا شکار نہیں۔کیونکہ دینے والی ذات اسے اپنی عطا سے محروم بھی کرسکتی ہے۔

ہمیں شعر کہتے ہوئے اس ذاتِ باری تعالیٰ کی حیثیت اور مقام کو کبھی بھی ذہن سے محو نہیں ہونے دینا چاہیے جس نے ایک خوبصورت تخیّلاتی دنیا ہمارے لیے سجا رکھی ہے اور اس فن کو انسانی تسکین اور انسانیت کی ترویج کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔بعض اوقات ہم اپنے خیال کے پنچھی کو مکانی حدود سے ورے لامکاں تک اڑان دیتے ہوئے بے اعتدالی کا شکار ہو کر اس ذاتِ باری تعالیٰ سے مبارز طلب ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ ہمارا میدانِ سخن نہیں ہوتا ہمیں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہوئے احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا قطعاً زیب نہیں دیتا۔اسے تصوف کا رنگِ سخن قرار دینا اپنی حماقتوں کے جواز کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ تصوف کی نزاکتوں کا ادراک ہم جیسے کم علم لوگوں کو کہاں۔شعر ایک دریافتی عمل ہے جسے ہم تخلیق کا نام دے دیتے ہیں کیونکہ یہ خیال کی مٹھی میں بند ہے اس لیے اسے روحانی سفر کہنا بجا ہوگا جو ماضی، حال اور مستقبل میں بیک وقت جاری و ساری رہتا ہے اور یہ اتنا تیز رفتار ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنے خالق کی رگیں کاٹ دیتا ہے۔

1977ء تا 1980ء کا عرصہ جامعہ پنجاب اورئنٹل کالج شعبہ عربی میں بطور طالب علم گزرا۔میں اورئنٹل کالج اور وولنر ہوسٹل میں گزارے ہوئے ان سہانے دنوں کو کبھی نہیں بھول پایا۔لال حویلی کی طرح پراسرار اور رومانوی تاثر لیے ہوئے یہ کالج شاید کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتا جس نے وہاں کچھ دن گذارے ہوں، اس دوران میری بہت سارے مشاہیر

ادب سے ملاقاتیں رہیں جن میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر شہباز ملک، ڈاکٹر اسلم رانا، ڈاکٹر اکرم شاہ، ڈاکٹر غلام حسین اور میرے شعبہ عربی کے مشاہیر اساتذہ جن سے میں نے براہِ راست استفادہ کیا۔ڈاکٹر ذوالفقار ملک، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، پروفیسر عبدالصمد صارم، مولانا حافظ نور الحسن، ڈاکٹر سید مظہر کبیر، ڈاکٹر یحییٰ سلطان ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہو گئے۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔اس دور کے میرے ساتھی جن سے میں آج بھی رابطے میں ہوں ڈاکٹر ذوالفقار رانا، پروفیسر محمد حمزہ، پروفیسر منیر ابن رزمی، اسلم خاور سیال پروڈیوسر PTV، پروفیسر شاہد چودھری، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر مرغوب طاہر، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، ڈاکٹر ظہیر احمد بابر خاں ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریز پنجاب، شہریار جاوید ایڈووکیٹ، ڈاکٹر رانا تنویر قاسم، خواجہ خورشید انور، عبدالقدیر خاموش، ڈاکٹر عبدالغفور راشد، سید محمد زکریا شاہ، ثروت صدیقی، طارق بٹ، ڈاکٹر سلیم طارق، ڈاکٹر حافظ محمد ادریس زبیر اُن تمام حضرات سے ایک روحانی تعلق محسوس کرتا ہوں۔میری بہت سی یادیں ان حضرات سے وابستہ ہیں۔بہت سارے اور نام ہیں جن سے آج کل میں رابطے میں نہیں۔ان تمام حضرات کے لیے دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا و آخرت میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین۔

امید کرتا ہوں کہ میرا سوہنا رب ’’کھنکتی خاک‘‘ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے گا۔ صاحبانِ فراست سے ان کی قیمتی آراء کا خواستگار ہوں۔

دعاگو

احمد ساقی

لالہ زار کالونی، اوکاڑا

0300-6647627 / 0321-8590195

◎

میں کھنکتی خاک فسردہ جاں تو بتا مجھے
یہ عروج ہے کہ زوال ہے مرے پاس آ

◎

کھنکتی خاک میں روکا گیا ہوں
اشارے تک یہاں ٹھہرا ہوا ہوں

حمد

لفظ ہر لمحہ ترا ذکر و بیاں کرتے ہیں
ہانپ جاتے ہیں مگر پھر بھی کہاں کرتے ہیں

تجھ کو چپ سوچتے رہنا ہی بھلا لگتا ہے
لفظ بے کار معانی کا زیاں کرتے ہیں

تو بڑا، کتنا بڑا، کتنا کہوں میں تجھ کو
تیری تعمیل سبھی کون و مکاں کرتے ہیں

تو ہے مستغنی کسی حمد و ثنا سے مولیٰ
تیری تسبیح تو یہ دونوں جہاں کرتے ہیں

مجھ کو حیرت ہے کہ بینائی کے ہوتے ہوئے بھی
کیسے انکار ترا لوگ یہاں کرتے ہیں

صبغۃ اللہ میں جو رنگے گئے ہوں احمدؔ
وہ اسے دیکھنے کی ضد بھی کہاں کرتے ہیں

نعت

حسین رنگ دھنک خاک سے نکلتی تھی
وجودِ سیدِّ لولاکؐ سے نکلتی تھی

وہ ایک خوشبو کہ جس کی کوئی مثال نہیں
مرے حضوؐر کی پوشاک سے نکلتی تھی

میں واں نہیں تھا مگر اک دعا مری خاطر
نبیؐ کے دیدۂ نمناک سے نکلتی تھی

جہاں جہاں پہ حضورؐ اپنے پاؤں رکھتے تھے
کرن کرن خس و خاشاک سے نکلتی تھی

تلاشِ احمدِؐ عالی مقام کے پیچھے
عجیب روشنی افلاک سے نکلتی تھی

میرے ہونے کا مجھے پہلے یقیں ہونے دے
پھر عدم کا تو مجھے تخت نشیں ہونے دے

ورنہ یہ بات عبادت کی رہے گی تشنہ
پہلے تسلیم کے قابل یہ جبیں ہونے دے

تو مجھے جلوہ دکھا اپنا مرے سامنے آ
حشر موسیٰ کی طرح بعد ازیں ہونے دے

میں تری ذات کا حصہ تو نہیں ہوں پھر بھی
مرے مولیٰ تو مجھے عرش نشیں ہونے دے

تیرا اثبات مکمل تبھی ہوگا مجھ میں
پہلے اندر تو مرے ایک "نہیں" ہونے دے

خلق اب ساری تری داد رسی کو ترسے
کل جو کرنا ہے تجھے آج یہیں ہونے دے

◎

میری خاک کو جب آئنہ بنا دیا گیا
عکس بھر دیئے گئے خدا ہٹا دیا گیا

پہلے میری ذات کو بنا دیا گیا تھا اشک
پھر خدا کی آنکھ سے اسے گرا دیا گیا

میری زندگی تو یوں کھڑے کھڑے ہی کٹ گئی
بیٹھنے دیا گیا نہ راستہ دیا گیا

راستوں کی دھول تھا تو پوچھتا نہ تھا کوئی
سنگِ میل کیا ہوا نشاں مٹا دیا گیا

ایک بار ہی نہیں سو بار یہ ستم ہوا
زندگی کی آنکھ کو رلا رلا دیا گیا

منفعت، منافقت کی محفلیں سجی رہیں
جس نے دل کی بات کی اسے اٹھا دیا گیا

روشنی نے جب کیا ستمگروں کو بے نقاب
بے حسی کے ہاتھ سے دِیا بجھا دیا گیا

◎

یقینِ خالقِ کون و مکان رہتا ہے
مگر کہیں کہیں وہم و گمان رہتا ہے

وہ جس مکان میں پہلے مکین رہتا تھا
اسی مکین میں اب وہ مکان رہتا ہے

جنابِ منصفِ اعلیٰ ! ابھی ذرا رکیے
ابھی قتیل کا اپنا بیان رہتا ہے

میں جب سے خوف کی دیوار پھاند آیا ہوں
مرے وجود میں امن و امان رہتا ہے

مری تلاش مجھے دشت میں اٹھا لائی
یہیں کہیں پہ مرا خاندان رہتا ہے

یونہی پرندے کسی خوف میں نہیں رہتے
کوئی تو تیر بدستِ کمان رہتا ہے

یہ جان کر تو تحیّر میں مبتلا ہوا میں
کہ ایک ذرے میں پورا جہان رہتا ہے

◎

میں زمیں سے آ رہا ہوں آسماں سے تو نکل
اے مرے خاکی بدن، اب درمیاں سے تو نکل

کائناتی وسعتوں سے آشنا ہونا ہے گر
پھر مری جاں، زندگی کے سائباں سے تو نکل

کیسا ڈر ہے تیرے اندر جو کھنچا رہتا ہے تو
یا کماں کو توڑ دے یا پھر کماں سے تو نکل

مجھ پہ گر احسان کرنا ہے تو یوں احسان کر
چل اٹھا کردار اپنا داستاں سے تو نکل

گر تعلق کو نبھانا بوجھ ہے تیرے لئے
لا، اسے میں توڑتا ہوں امتحاں سے تو نکل

روشنی میں دب گئی ہے تیری اپنی ذات بھی
اے مرے ننھے ستارے کہکشاں سے تو نکل

◎

عدم کا خوف تھا، وہ بھی اتار بیٹھا ہوں
اب اپنی موت کے سر پر سوار بیٹھا ہوں

شبِ گماں کا فقط انتظار ہے مجھ کو
میں اپنے حصے کا دن تو گزار بیٹھا ہوں

مرے وجود کا کوئی مشاہدہ تو کرے
میں کیسی گرد میں بن کر غبار بیٹھا ہوں

اب آئنوں سے عداوت نہیں رہی مجھ کو
تحیّرات کے صدمے گزار بیٹھا ہوں

کوئی تو آئے مرے پاس تعزیت کرنے
وجودِ خاک لحد میں اتار بیٹھا ہوں

بہت تضاد ہے میرا جہان والوں سے
سو اپنی ذات کا بن کر حصار بیٹھا ہوں

◎

روداد مجھ سے دل کی سنائی نہیں گئی
اس واسطے رگوں سے دہائی نہیں گئی

اک خواب تو اٹھا لیا میں نے چُرا کے آنکھ
تعبیر اس کی مجھ سے اٹھائی نہیں گئی

گو ہجر پورے شہر کی چوکھٹ سے اٹھ گیا
لیکن مری گلی سے جدائی نہیں گئی

پتھر بنا ہوا تھا میں اپنے وجود میں
دریا سے میری لاش اٹھائی نہیں گئی

پشتے میں باندھتا رہا اپنے وجود پر
لیکن مرے بدن کی کٹائی نہیں گئی

اتنا ہی فرق ہے مرے اور قیس میں حضور
بس مجھ سے اپنی خاک اُڑائی نہیں گئی

رستے بچھا دیے گئے ہر سمت میں مگر
دیوار راستے کی ہٹائی نہیں گئی

چہرے پہ گرچہ تو نے تغافل سجا لیا
آنکھوں سے دل کی بات چھپائی نہیں گئی

◎

اگر تجھ کو زمیں کے چاک محور سے نکلنا ہے
تو پھر مر کر تجھے مٹی کے اندر سے نکلنا ہے

پرانے ساحلوں پر اس لیے آتا ہوں میں ہر روز
کسی بوڑھے سفینے کو سمندر سے نکلنا ہے

کئی انکار ایسے بھی پڑے ہیں میرے سینے میں
جو کہتے ہیں ہمیں دستِ پیمبر سے نکلنا ہے

تیقّن ہے مجھے اس بے یقینی کی فضا میں بھی
کوئی چشمہ یہیں حیرت کے پتھر سے نکلنا ہے

یہ کس مرگِ مسلسل میں گھرا رہتا ہوں میں ہر دم
مجھے ہر حال میں اس موت منظر سے نکلنا ہے

◎

بتانِ دَیر و حرم میں یہ کیا دکھائی دیا
سبھی کا رنگ مجھے ایک سا دکھائی دیا

بلوں میں گھسنے لگے سانپ بھی سپیرے بھی
کسی کو موسیٰ کسی کو عصا دکھائی دیا

اٹھا کے ہاتھ جسے مانگتا رہا برسوں
وہ مدّعا مجھے حرفِ دعا دکھائی دیا

مری رگوں میں لہو کا دباو بڑھتا رہا
درونِ خانہ عجب معرکہ دکھائی دیا

وہ ایک شخص جو پہلے مرے ہی جیسا تھا
دل و نگاہ میں اترا خدا دکھائی دیا

تری نگاہ میں گنجائشیں زیادہ تھیں
مجھے تو چاروں طرف ہی خدا دکھائی دیا

بھٹک رہا تھا میں اپنے حصار میں احمدؔ
مرے وجود میں پھر راستہ دکھائی دیا

◎

شوقِ ہجرت میں ہوئی ہے پیٹھ کعبے کی طرف
چھوڑ کر مکہ چلا ہوں میں مدینے کی طرف

تُل گئے ہیں اب مری تقسیم پر ارض وسما
ایک اوپر کھینچتا ہے ایک نیچے کی طرف

اب دوانہ توڑ دے گا سارے شیشے کے محل
ہاتھ پتھر پر ہے اسکا آنکھ شیشے کی طرف

فیصلہ کرنا پڑے گا اب تجھے بھی لازماً
تو شکاری کی طرف ہے یا پرندے کی طرف

ہجرتوں کا فیصلہ اس بات پر موقوف ہے
تو مری جانب مڑے گا یا قبیلے کی طرف

میں تو آغازِ سفر پر ہی کھڑا ہوں اب تلک
کوئی مجھ کو آگے کھینچے کوئی پیچھے کی طرف

◎

بھلا کر سارے ہی اپنے ہنر بیٹھے ہوئے ہیں
پرندے شاخ پر بے بال و پر بیٹھے ہوئے ہیں

یہ کیسی دھوپ ہے مولیٰ کوئی سایہ نہیں ہے
کہ چھتری تان کر سارے شجر بیٹھے ہوئے ہیں

کبھی تو مل ہی جائے گا انہیں بھی اذنِ ہجرت
مسافر باندھ کر رختِ سفر بیٹھے ہوئے ہیں

کوئی تو واسطہ رشتہ ہمارا تم سے ہو گا
تمہارے سامنے جو چشمِ تر بیٹھے ہوئے ہیں

بِنا پختہ نہیں رکھی مکینوں نے مکاں کی
کہ اس کے سارے ہی دیوار و در بیٹھے ہوئے ہیں

مکینوں کی رگوں میں تیرگی پھیلی ہوئی ہے
مگر دیوار پر شمس و قمر بیٹھے ہوئے ہیں

ہماری آہ کیوں تاثیر سے خالی ہوئی ہے؟
ذرا سوچیں! یہاں اہلِ نظر بیٹھے ہوئے ہیں

ہمیں معلوم ہے پردہ نشینی کا سبب بھی
اگرچہ ہم بظاہر بے خبر بیٹھے ہوئے ہیں

◎

کھنکتی خاک میں روکا گیا ہوں
اشارے تک یہاں ٹھہرا ہوا ہوں

ہزاروں حیرتیں زندہ ہیں مجھ میں
میں شیشہ گر کے گھر کا آئنہ ہوں

کئی اسرار جلتے ہیں مرے ساتھ
کسی ویران مندر کا دیا ہوں

یہ کیسی تیرگی پھیلی ہوئی ہے
میں کیسی روشنی میں آ گیا ہوں

کسی قابیل کا مجھ پر اثر ہے
پرندوں سے میں اب بھی سیکھتا ہوں

◎

چارہ گر! اپنی سُنا میری کہانی مت پوچھ
کس طرح میں نے گنوا دی ہے جوانی مت پوچھ

قلب و جاں سے کیسے جاتے ہیں سبھی اشک کشید
کس اذیت سے گزرتا ہے یہ پانی مت پوچھ

دیدنی ہوتی ہے آشفتہ سری دریا کی
موسمِ ہجر میں اشکوں کی روانی مت پوچھ

درد کے اشک میں ڈھلنے کا سفر مشکل ہے
کس طرح ہوتی ہے یہ نقلِ مکانی مت پوچھ

بھیگ جاتا ہوں میں برسات کے موسم کی طرح
کیسے ہوتی ہے تری یاد فشانی مت پوچھ

◎

خاک کے گنبدِ مسمار سے کب نکلیں گے
ہم ترے حسن کے آزار سے کب نکلیں گے

کیسے وقت میں کچھ بھی نہیں باقی اب تو
زندگی ہم ترے بازار سے کب نکلیں گے

کب مرے قتل کے اسرار کھلیں گے یاں پر
قطرے خوں کے تری تلوار سے کب نکلیں گے

اب تو رسوائی درو بام پہ اگ آئی ہے
اے خدا! ہم ترے انکار سے کب نکلیں گے

حبس کے زہر سے امّید کٹی جاتی ہے
خواب اپنے درودیوار سے کب نکلیں گے

کب سجیں گے تری پلکوں پہ ستارے بن کر
ہم ترے دیدۂ بیزار سے کب نکلیں گے

◎

خیر و شر میں کشمکش جو باہمی ہے میرے اندر
ایسے لگتا ہے کہ جیسے آدمی ہے میرے اندر

کون ہے جو وسوسوں کی آگ دہکاتا ہے دل میں
ہاں، یقیناً وہ پرانا دوزخی ہے میرے اندر

جب بھی چمکا تیرا چہرہ میری یادوں کے افق پر
میں نے دیکھا روشنی ہی روشنی ہے میرے اندر

اضطرابی کیفیت کا اک سبب تو بھی ہے شاید
اک ترا حصہ کہیں پر لازمی ہے میرے اندر

میں وفاؤں کے صلے میں توڑ دیتا ہوں تعلق
میرے مولیٰ! کس طرح کی بے رخی ہے میرے اندر

اے خدا! تیرے سوا کچھ بھی نہیں ہے اس جہاں میں
میری کوتاہی پہ مت جا کاہلی ہے میرے اندر

◎

بھیڑ یہ اچھی نہیں ہے کھرے کچھ یار الگ کر
تجھ کو بہتر جو لگیں بس وہی دو چار الگ کر

پہلے آ میرے برابر جو مقابل ہے اترنا
تخت سے نیچے اتر اور یہ دستار الگ کر

ساتھ دیوار کے تو مجھ کو لگا رکھا ہے تو نے
بات کرنی ہے تو پھر پہلے یہ دیوار الگ کر

میں نہتا مرے منصف مرا دشمن ہے مسلح
مجھ کو تلوار عطا ہو یا وہ تلوار الگ کر

دربدر خاک نشیں ہوں مرا گھر بار یہی ہے
تو مجھے اپنا بنا مجھ سے یہ گھر بار الگ کر

مجھ سے کرتا ہے محبت تو عقیدہ بھی بدل پھر
تو مرے واسطے اپنے سبھی تہوار الگ کر

◎

نوکِ خنجر پہ تھیں نظریں نہ ہی تلوار پہ تھیں
مرنے والے کی نگاہیں تو رخِ یار پہ تھیں

دیمکِ وقت نے چاٹے ہیں مضامین سبھی
اب وہ تحریریں کہاں جو لب و رخسار پہ تھیں

کون کہتا ہے کہ تصویریں ہوئی ہیں معدوم
اب وہ دیوار کے پیچھے ہیں جو دیوار پہ تھیں

میں ہمیشہ ہی ان آنکھوں کی پذیرائی میں تھا
جو کمر بستہ بظاہر مرے انکار پہ تھیں

مجھ سے کیا ان کو عداوت تھی اگر چپ رہتا
یہ سزائیں تو مری ذات کے اظہار پہ تھیں

عید کے چاند کا اعلان ہوا تھا جس دم
اس گھڑی آنکھیں مری سامنے دیوار پہ تھیں

◎

مجھ کو تسلیم ہے یہ وقت بڑا مبہم ہے
پر مرا غم تو کسی اور طرح کا غم ہے

جو بھی کہنا بِلا تمہید ہی کہنا مجھ سے
کیونکہ اب وقت مرے پاس بہت ہی کم ہے

سینہ کوبی ہے ، نہ نوحہ ، نہ کوئی اشک رواں
بارگاہِ دل و جاں میں بھی عجب ماتم ہے

اب مرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا
اب مرے کوزۂ خاکی کے لبوں پر دم ہے

ایک دیوار ہی رہتی ہے گرانے کے لیے
اُس طرف تو نہ کوئی "تم" ہے نہ کوئی "ہم" ہے

کیا کوئی اور بھی ہے قرض چکانا مجھ کو
دل بھی برباد ہوا آنکھ بھی میری نم ہے

◎

کیسے ممکن ہے کہ دریا میں روانی نہ رہے
درد تو دل میں رہے آنکھ میں پانی نہ رہے

کاش ایسی کوئی ترکیب میّسر آئے
کارِ ہجرت تو رہے نقلِ مکانی نہ رہے

زندگی ایسے گزرتی ہے جوانی کے بغیر
جیسے کردار رہے اور کہانی نہ رہے

کئی کردار نئے ڈال دیے ہیں اس میں
تاکہ یہ درد کہانی بھی پرانی نہ رہے

موسمِ حبس کی تعزیر سے بے حال ہوں میں
گنگناؤ کہ طبیعت میں گرانی نہ رہے

◎

دلوں میں دوریاں اور فاصلے رکھے ہوئے ہیں
بظاہر ہر کسی سے رابطے رکھے ہوئے ہیں

بنامِ زندگی کچھ قاعدے رکھے ہوئے ہیں
نظر نے اپنے اپنے زاویے رکھے ہوئے ہیں

بڑی تنظیم اور تدریج سے گھائل ہوا ہوں
ستمگر نے ستم کے ضابطے رکھے ہوئے ہیں

ہمارا تو یہاں پر اور مصرف ہی نہیں ہے
جہاں میں ہم تمہارے واسطے رکھے ہوئے ہیں

مجھے میرے علاوہ کچھ نظر آئے تو کیسے؟
مری اطراف میں تو آئنے رکھے ہوئے ہیں

جہاں سے بھی گزرتا ہوں الجھ جاتے ہیں پاؤں
زمیں پر ہر طرف ہی دائرے رکھے ہوئے ہیں

ہمارے کل اثاثے کی کوئی قیمت تو ہوگی؟
جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے رکھے ہوئے ہیں

◎

یوں چمکتی ہے اداسی شبِ تنہائی میں
جیسے مہتاب کوئی پوری توانائی میں

ایسے لگتا ہے مجھے زیست کا یہ کھیل کبھی
اک تماشا ہو بپا جیسے تماشائی میں

کوئی انکار سا آنکھوں میں اتر آیا ہے
تیرگی پھیل رہی ہے مری بینائی میں

ذکر سنتے ہی ترا حال میں آ جاتا ہے
کیسی آشفتہ سری ہے ترے سودائی میں

دل کے ہمراہ بھرم جانے کا اندیشہ ہے
خاک اڑتی ہے ان آنکھوں کی پذیرائی میں

دل ہتھیلی پہ سجا کر درِ امکان تلک
آ گیا ہوں میں تری حوصلہ افزائی میں

◎

میری آنکھوں کا ہنر بھی اس طرف جاتا نہیں
نور کے پردے کے پیچھے کچھ نظر آتا نہیں

اک تباہی آرہی ہے لال سی آندھی لیے
میں وہ پاگل ہوں کہ جس کی کوئی بھی سنتا نہیں

کیا کسی نے برف بھر دی ہے رگوں کے بیچ میں
گھاؤ جب گہرا بہت ہے خون کیوں رِستا نہیں

کاٹ ڈالے گا کسی دن مجھ کو میرا یہ خیال
جس طرح میں سوچتا ہوں اس طرح کہتا نہیں

ہٹ گیا ہے راستے سے اپنے رخ کو موڑ کر
جس جگہ بہتا تھا دریا اب وہاں بہتا نہیں

اس قدر اب ہو گئے ہیں لوگ زہریلے یہاں
جب تلک سر کو نہ کچلو کوئی یاں مرتا نہیں

◎

ایسے لگتا ہے کہ جیسے کچھ یہاں ہونے کو ہے
سر اٹھاتی یہ زمیں اب آسماں ہونے کو ہے

آگ تو اڑ ہی رہی تھی آندھیوں کے دوش پر
اب سروں پر بھی دھویں کا سائباں ہونے کو ہے

یہ زمیں کچھ بولتی ہے کان دھر کر تو سنو
اس کے اندر جو نہاں ہے وہ عیاں ہونے کو ہے

میں عدالت میں کھڑا ہوں فیصلے کا منتظر
میرے اعضائے بدن کا اب بیاں ہونے کو ہے

کون گدلے پانیوں میں تیر سکتا ہے یہاں
ایسی مشّاقی کا اک دن امتحاں ہونے کو ہے

کھینچ تو تم نے لیا میری رگوں کا سب لہو
اب تمہاری بھی کہانی داستاں ہونے کو ہے

◎

پردۂ غیب میں اسرار پڑے ہیں
جو ابھی تشنۂ اظہار پڑے ہیں

میں زمیں پر جو گرا تو یہ صدا آئی
تجھ سے مجھ میں کئی کردار پڑے ہیں

میں ابھی خود کو بھی تسلیم نہیں ہوں
میرے اندر کئی انکار پڑے ہیں

مدّتوں بعد یہ محسوس ہوا ہے
میرے سینے میں تو اشعار پڑے ہیں

اک ترے پاس ہی تعویذِ شفا ہے
ہم ترے عشق میں بیمار پڑے ہیں

اب پرندے بھی نہیں آتے مرے پاس
سونے سونے در و دیوار پڑے ہیں

حجرۂ دل سے وہاں کوچۂ جاں تک
ہر قدم پر مرے انکار پڑے ہیں

◎

رہی وہ آس پاس ہی خبر نہیں ہوئی
گزر گئی ہے زندگی بسر نہیں ہوئی

ہوئی تھی ختم داستاں مرے وجود کی
عشاء کے وقت تو میں تھا سحر نہیں ہوئی

رخ اس نے آفتاب کا گھما لیا اُدھر
اِدھر تو شام ہوگئی اُدھر نہیں ہوئی

اسی لیے تو مدّعا کہا نہیں اسے
میں کیسے جی سکوں گا پھر اگر "نہیں" ہوئی

یہ عاشقی نہیں ہے کیا کہ تجھ کو دیکھ کر
کبھی مری نظر اِدھر اُدھر نہیں ہوئی

◎

آفتابِ زندگی ڈھلتا رہا میں بے خبر
خوابِ غفلت میں کہیں کھویا رہا میں بے خبر

ایک دن ایسے ہوا کہ میرا اپنا خاندان
میرے بالیں پر کھڑا روتا رہا میں بے خبر

جس شجر پر ایک دن مصلوب ہونا تھا مجھے
اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں سویا رہا میں بے خبر

جس کو پانے کی تمنا میں کٹی تھی زندگی
وہ بھی میری آرزو کرتا رہا میں بے خبر

وہ جدائی کے دوراہے تک مجھے لاتا گیا
وصل کی چاہت لئے چلتا رہا میں بے خبر

◎

روح پرواز کو تیار کھڑی ہے
راہ میں جسم کی دیوار کھڑی ہے

زیست بھی مرنے پہ آمادہ نہیں اور
موت بھی برسرِ پیکار کھڑی ہے

زندگی تیرگی میں ہوگئی غرقاب
روشنی سامنے لاچار کھڑی ہے

مجھ سے اٹھتا نہیں بوجھ اپنی انا کا
تو مرے سامنے بے کار کھڑی ہے

خوفِ تردید سے بے تاب تمنّا
ابھی تک تِشنۂ اظہار کھڑی ہے

میرے دل میں جو نہاں ہے وہی تصویر
سرحدِ شوق سے اس پار کھڑی ہے

حوصلہ دیکھئے دیوار کا احمدؔ
کس طرح ہو کے وہ مسمار کھڑی ہے

◎

عجب یہ روشنائی ہے سجھائی کچھ نہیں دیتا
مجھے دن کے اجالے میں دکھائی کچھ نہیں دیتا

کوئی بہرہ نہیں ہے یاں یہ شوریدہ سی بستی ہے
صداؤں کے برابر میں سنائی کچھ نہیں دیتا

بظاہر تو وہ مجرم ہے مگر معصوم لگتا ہے
وہ یوسف کی طرح اپنی صفائی کچھ نہیں دیتا

میں صدیوں سے پڑا ہوں ایک دوراہے کی چوکھٹ پر
وہ لاپروا اسیری یا رہائی ، کچھ نہیں دیتا

دلاسوں حوصلوں اور چند لفظوں کے علاوہ یاں
ضرورت ہو تو پھر بھائی کو بھائی کچھ نہیں دیتا

◎

از ازل تا با ابد سوچا ہوا ہے
وقت کو زنجیر سے باندھا ہوا ہے

ٹوٹنے والی ہے یہ لمحوں کی زنجیر
اک اشارے نے اسے روکا ہوا ہے

مدتوں سے تیرے جانے کا وہ منظر
آنکھ کی دہلیز پر بیٹھا ہوا ہے

دیکھتے ہی اس نے مجھ سے یہ کہا تھا
تجھ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے

آج کل اکثر یہی میں سوچتا ہوں
مجھ سا پہلے بھی کوئی گزرا ہوا ہے

◎

وہ جہاں سے بھی گزرتا ہے فضا گونجتی ہے
جیسے سرسوں بھرے کھیتوں میں ہوا گونجتی ہے

حسن اعضا کے توازن سے ہی موسوم نہیں
ان کے مابین حسینوں کی ادا گونجتی ہے

چیختا ہوں تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی
خامشی اوڑھ کے لیٹوں تو صدا گونجتی ہے

دل کسی اور طرف جانے نہیں دیتا مجھے
تیری جانب جو چلوں میں تو انا گونجتی ہے

سرمئی آنکھ کا اپنا ہی فسوں ہے احمدؔ
دل کی بیزاری الگ روح جدا گونجتی ہے

◎

موت کی راہوں پہ جب سے ہم قدم چلنے لگے
زندگی کے سب معانی واہمے لگنے لگے

میری مٹی کا زمیں سے اس قدر ہوتا ملیل
میں فقط ایڑی لگاؤں یہ زمیں چلنے لگے

زہر آلودہ ہوئی ہیں اس قدر یہ بستیاں
بستیوں میں آنے والے سانپ بھی مرنے لگے

آسماں نے موسمِ گل سے لیا یوں انتقام
پھول جب شاخوں پہ چمکے تو شرر اڑنے لگے

نزع کی جب آگ میری پسلیوں تک آ گئی
تب مری آنکھوں کے اندر خواب سے اگنے لگے

اژدھے جب مار ڈالے سب زمیں سے کھینچ کر
میری اپنی آستیں میں سانپ سے پلنے لگے

◎

خوف کی سر پہ تنی ایک رِدا رہتی ہے
میری نس نس سے جُڑی میری قضا رہتی ہے

تو مجھے کیسے ہزیمت سے کرے گا دو چار
میرے اندر تو مری ماں کی دعا رہتی ہے

پھرتی رہتی ہے یہ کس کھوج میں معلوم نہیں
اک سماعت کے تعاقب میں صدا رہتی ہے

کیسی تفریق مچی ہے کہ مری اپنی یہ ذات
مجھ میں رہتی ہے مگر مجھ سے جدا رہتی ہے

جبر کی قید میں محبوس پرندوں کے سبب
درد میں ڈوبی ہوئی ساری فضا رہتی ہے

دستکیں دیتی ہے دروازوں پہ اکثر احمدؔ
دو بدو جلتے چراغوں کے ہوا رہتی ہے

◎

چاہتوں کے استعارے دیکھیے
ہاتھ سے بنتے اشارے دیکھیے

پڑھنا ہے خوشبو کو گر تفصیل سے
پھول کے تازہ شمارے دیکھیے

غم کی ندیا بہہ رہی ہے موج میں
آنکھ کے سوکھے کنارے دیکھیے

موت کے کالے سمندر میں یہاں
ڈوبتے دل کے نظارے دیکھیے

آگ پر رکھ کر ہتھیلی کی بیاض
اپنی قسمت کے ستارے دیکھیے

چلچلاتی دھوپ میں دیوار پر
جل رہے ہیں دکھ ہمارے دیکھیے

◎

تیری آنکھوں ترے چہرے سے نکل آئے ہیں
دیدۂ و دل ترے رستے سے نکل آئے ہیں

جن کو میں توڑ کے بت خانے میں پھینک آیا تھا
وہی پتھر مرے کعبے سے نکل آئے ہیں

ہوگیا تیز ہمارا ابھی بکھرنے کا عمل
جب سے زنجیر کے حلقے سے نکل آئے ہیں

روٹھ جائے نہ کہیں اپنے بدن کا سایہ
اس لیے پیڑ کے سائے سے نکل آئے ہیں

سوچ کر، آخری تجھ سے یہ ملاقات نہ ہو
اشک بھی آنکھ کنارے سے نکل آئے ہیں

اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے لگے ہیں جب سے
ہم ترے عشق کے دھارے سے نکل آئے ہیں

جان و دل رکھ کے ہتھیلی پہ بلا خوف و خطر
تیری آنکھوں کے اشارے سے نکل آئے ہیں

◎

سوچا نہیں تھا ایسے گزاریں گے زندگی
تجھ بے وفا کے سامنے ہاریں گے زندگی

کچھ رفتگاں بھی اب نظر آنے لگے مجھے
اب یہ تجھے لحد میں اتاریں گے زندگی

اک بار پھر ملی تو بصد شوق و افتخار
ہم وہ بھی تیرے ساتھ گزاریں گے زندگی

دیکھیں گے اپنی موت کو جی بھر کے دوستو!
جس وقت اس کے سامنے ہاریں گے زندگی

کچھ دیر کے لئے صفِ ماتم بچھائیں گے
پھر چیخ چیخ کر وہ پکاریں گے زندگی

پتھر شگاف آئینہ صورت بنائیں گے
اک روز ایسا روپ بھی دھاریں گے زندگی

تزئین زندگی کا ہمیں مشورہ نہ دو
تم مل گئے تو ہم بھی سنواریں گے زندگی

◎

اور تو کوئی نہیں تیرے سوا ، سامنے آ
اب بہت ہو چکا ، اے میرے خدا ، سامنے آ

حسنِ نایاب کے جلوے ہیں نمایاں ہر سُو
اب یہ بے سود سی چلمن بھی ہٹا ، سامنے آ

تیری یادوں کا سفر پھیل گیا ہے اتنا
روح تک ہونے لگی آبلہ پا ، سامنے آ

لازماً حشر بپا ہو گا یقیں ہے مجھ کو
چار سُو ہے یہ صدا سامنے آ ، سامنے آ

میں اسے قتل نہ کرتا تو بتا کیا کرتا
اس نے جب سامنے آ کر یہ کہا ، سامنے آ

تو نے ٹھہرایا ہے جب موردِ الزام مجھے
اب تو ثابت بھی اسے کر کے دکھا ، سامنے آ

کھل کے آنا ہی پڑے گا تجھے اک دن احمدؔ
مصلحت چھوڑ ابھی حال میں آ ، سامنے آ

◎

کوئی حوالہ نہ کوئی پتہ ہے میرے پاس
بس اک طویل سفر راستہ ہے میرے پاس

میں چل رہا ہوں فقط اس لئے کہ رکنا نہیں
دیارِ غیر ہے اور قافلہ ہے میرے پاس

پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں شبِ سیاہ کے بیچ
دعائے خیر ہے اور اک دِیا ہے میرے پاس

امیدِ کارِ جہاں اور اک نوازِش خاص
خدائے کون و مکاں کی عطا ہے میرے پاس

میں جب بھی اپنے مصائب کا ذکر کرتا ہوں
فرات چیختا ہے کربلا ہے میرے پاس

جہانِ عشق میں سرمایۂ حیات مرا
بس ایک تُو ہے فقط اور کیا ہے میرے پاس

میں اپنی خاک کی کٹیا میں سربسجدہ ہوں
چراغِ خواب ہے اور اِک دعا ہے میرے پاس

◎

زیست کے ظاہری اسباب میں الجھا ہوا ہوں
اپنی ہی ذات کے گرداب میں الجھا ہوا ہوں

روح تو گوشۂ خلوت کی تمنائی ہے
جب کہ میں کثرتِ احباب میں الجھا ہوا ہوں

کہکشاں سے تو نکل آیا میں جیسے تیسے
اب کسی جلوۂ مہتاب میں الجھا ہوا ہوں

پہلی خواہش کی سزا کاٹ رہا ہوں کب سے
اب نئی خواہشِ بے تاب میں الجھا ہوا ہوں

رات بھاری سی لگی تو مجھے محسوس ہوا
میں بھیانک سے کسی خواب میں الجھا ہوا ہوں

◎

طاقِ دل پر تری تصویر جلا رکھتے ہیں
اس طرح ہم سخن آرائی بپا رکھتے ہیں

خاک و ناخاک کے چکر میں پڑے رہتے ہیں ہم
روح رکھتے ہیں الگ جسم جدا رکھتے ہیں

جانے کب لوٹ کے آجائے بدن کا سایہ
دھوپ کی اور میں دروازہ کھلا رکھتے ہیں

کوئی مانے کہ نہ مانے ہمیں انکار نہیں
ہم عقیدوں کی منڈیروں پہ خدا رکھتے ہیں

ٹوٹ جائیں گی کسی روز طنابیں اس کی
خیمۂ دل میں تمنائیں سجا رکھتے ہیں

لوٹ جائے نہ کہیں دیکھ کے تیرہ شبی کو
ایک قندیل سی کھڑکی میں جلا رکھتے ہیں

◎

لباسِ ہجر پہن کر دھمال کرنے لگا
بچھڑ کے تجھ سے یہ دل بھی کمال کرنے لگا

تو کیا، یہ آپ کی آنکھیں بھی خواب دیکھتی ہیں؟
میں چپ ہوا تو وہ بچہ سوال کرنے لگا

میں اس کو چھوڑ کے جاؤں تو پھر کہاں جاؤں
یہ دل پھر اس سے تعلق بحال کرنے لگا

جسے میں روند کے نکلا تھا شہرِ دل کی طرف
وہی خیال مجھے پائمال کرنے لگا

میں پہلے شور شرابے کی زد میں رہتا تھا
اور اب سکوت بھی مجھ کو نڈھال کرنے لگا

ابھی سراغِ حقیقت نہیں ملا احمدؔ
وبالِ خیر ابھی سے نہال کرنے لگا

◎

تیر جو نکلا مری اندھی کماں سے
ٹوٹ کر تارا گرے گا آسماں سے

گر رہا ہے جسم کا ملبہ مسلسل
اب مکیں جانے لگا ہے اس مکاں سے

ہجر کے ہاتھوں مقیّد ہو گیا ہوں
جب سے میں نکلا ہوں تیری داستاں سے

میرے اندر گھنٹیاں بجنے لگی ہیں
اب کوئی اترے گا پہلے آسماں سے

کوئی لپکا تھا تڑپ کر میری جانب
میں نے جب خود کو پکارا خاکداں سے

◎

ٹوٹنے کو ہے ستارا دیکھئے
ہونے والا ہے اشارا دیکھئے

کونپلیں محوِ سخن ہیں آگ سے
زندگی کا استعارہ دیکھئے

بے خودی میں محوِ رقص حال ہے
برگِ گل پر آب پارہ دیکھئے

اوج سے ہم آ پڑے پاتال میں
پستیوں کا بھی نظارا دیکھئے

کوئی سنتا ہی نہیں میری صدا
میں نے خود کو بھی پکارا دیکھئے

روشنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف
جل رہا ہے گھر ہمارا دیکھئے

کر دیا دوزخ نے بھی اعلانِ جنگ
جون کا تازہ شمارہ دیکھئے

انکار میں ڈوبا ہے ترے شہر کا منظر
یاں کوئی کلیسا ہے نہ مسجد ہے نہ مندر

اس شہر سے نکلو یہ فرشتوں کا نگر ہے
شاید کہیں آئے ہمیں انسان میّسر

یہ خوف مجھے رات کو سونے نہیں دیتا
اک آدمی رہتا ہے مرے گھر کے برابر

صحرا کی بھی حالت کسی خطرے سے ہے دوچار
پیچھے کوئی دریا ہے اور آگے ہے سمندر

میں تجھ سے محبت نہیں کرتا مرے ہمدم
مجھ سا کوئی رہتا ہے تری ذات کے اندر

اپنی تو شریعت میں محبت ہے عبادت
جو عشق قبا پہنے وہی مست قلندر

ہر شخص ترے نام کی دیتا ہے دہائی
تو نے تو بدل ڈالا ہے اس شہر کا منظر

◎

نظر نے اوڑھ رکھا ہے سنہری خواب سا کیسا
مری آنکھوں کے اندر یہ ہوا ہے حادثہ کیسا

نکلنا بھی اگر چاہوں نکل پاتا نہیں اس سے
مرے پندارِ خاکی میں تمہارا دائرہ کیسا

ہمارے سب ستاروں کو تمہی گردش میں رکھتے ہو
بنا رکھا ہے تم نے بھی ہمارا زائچہ کیسا

بھلے دن بھول جاتے ہو بُرے دن یاد رکھتے ہو
خدا نے بھی بنایا ہے تمہارا حافظہ کیسا

تمہیں پانے نہ پانے کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا
تمہی کو سوچتے رہنے کا پھر یہ عارضہ کیسا

◎

رخِ یار کا تصور دلِ تشنہ کام جاناں
یہ چراغِ عاشقی ہے جلے صبح و شام جاناں

یہ سفر عجیب تر ہے کوئی سمت ہے نہ منزل
کرے دیکھئے کہاں پر مرا دل قیام جاناں

تجھے بھولنا پڑا تو مجھے مشکلیں نہ ہوں گی
یہ خیالِ خوش گمانی تھا خیالِ خام جاناں

تری عاشقی سے پہلے مجھے یہ خبر نہیں تھی
اسی دل لگی پہ ہو گا مرا اختتام جاناں

ترے عشق میں ہمیشہ ادب آشنا رہا ہوں
میں کبھی نہ بھول پایا ترا احترام جاناں

مری راحتوں کا محور مری آرزو کا مسکن
مری زندگی کا حاصل فقط ایک نام جاناں

◎

تو وجود ہے کہ خیال ہے مرے پاس آ
مری روح کا یہ سوال ہے مرے پاس آ

میں زمیں پہ آ کے بکھر گیا مجھے تھام لے
مجھے معصیت کا ملال ہے مرے پاس آ

مرا رنگ روپ لباس سب ہی بدل گیا
ترے ہجر کا یہ کمال ہے مرے پاس آ

میں کھنکتی خاک فسردہ جاں تو بتا مجھے
یہ عروج ہے کہ زوال ہے مرے پاس آ

تو ازل ابد تو ہے لامکاں مرا حرز جاں
تو ہی ایک ایسی مثال ہے مرے پاس آ

ترے نام کا جو سرور ہے مرا نور ہے
مرا انگ انگ نہال ہے مرے پاس آ

مری چاہتیں مری نسبتیں ترے نام سے
یہ مری حقیقتِ حال ہے مرے پاس آ

یہ سبھی گمان کا عکس ہے تو ہے ماوریٰ
تو نظر کا حسن و جمال ہے مرے پاس آ

مری حسرتوں کا وجود ہی ترا روپ ہے
تو جمال ہے تو جلال ہے مرے پاس آ

◎

زندہ رہنے کے لئے رستہ نکالا جائے
اب کوئی روگ نئے عشق کا پالا جائے

عشق کرنے کے تقاضے بھی عجب ہوتے ہیں
بات تو بات اشارہ بھی نہ ٹالا جائے

چاند بھی قید میں رہتا ہے کسی آنچل کی
جس طرف چاند چلے ہے وہیں ہالہ جائے

میں تری ذات کے سورج سے جلا ہوں اکثر
آبِ زمزم سے مرا جسم اجالا جائے

اپنی پلکوں سے چُنے تھے وہ جو کانٹے میں نے
میری آنکھوں سے اب ان سب کو نکالا جائے

وہ بڑا گہرا ہے پاتال چھپا ہے اس میں
اس کی ہر بات کو حکمت سے کھنگالا جائے

◎

کتابِ عشق کی آیات کا نزول ہوا
جو کچھ بھی تم نے کہا وہ ہمیں قبول ہوا

وہاں پہ اب بھی شریعت اسی کی رائج ہے
وہ قیس تھا جو کبھی دشت کا رسول ہوا

ہم اپنی ذات سے کیسے تجھے کشید کریں
ہماری روح میں پیکر ترا حلول ہوا

ہماری بات تری بات سے نہیں ملتی
اسی لئے تو ہمارا بیاں فضول ہوا

حضور تم سے تعلق ہے جاں نثاری کا
جو تم نے کہہ دیا اپنا وہی اصول ہوا

◎

اترتی جو مرے آنگن میں چنچل چاندسی مٹی
میں اسکو جان بھی دیتا اگر وہ مانگتی مٹی

کھلونوں کو بناتا ہوں میں خود اپنے تخیّل سے
خدا میں بھی تو کہلاتا اگر یہ بولتی مٹی

ہوئی تھی اک خطا اس سے بنامِ طمع ونسیاں
خدا نے آسمانوں سے زمیں پر پھینک دی مٹی

پریشاں دم بخود اک آگ سر کھولے کھڑی تھی واں
نہ جانے دیکھ لی اس نے جنوں میں کھولتی مٹی

بقیّہ رقص سب اس کے دکھاوا ہی دکھاوا ہیں
پیا کو جب منانا ہو تو پھر ہے ناچتی مٹی

◎

صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بکھر جانا ہے
دوستو! ہم کو کسی اور نگر جانا ہے

اس لیے زیست کے اسباب اکھٹے نہ کیے
مجھ کو معلوم تھا اک دن مجھے مر جانا ہے

زندگی سوچنے لگتی ہے کبھی ایسے بھی
اس جہاں سے مجھے اب اور کدھر جانا ہے

خواب کو تشنۂ تعبیر نہیں رکھنا مجھے
جو بھی کرنا ہے مجھے آج ہی کر جانا ہے

اک رویّہ ہے فقط جو کہ رہے گا زندہ
زندگی نے تو بہر طور گزر جانا ہے

میرے احساس تلذّذ کا ذریعہ ہے بدن
ایک دن روند کے اس کو بھی گزر جانا ہے

◎

گرچہ دیوار میری راہ میں ہے
پھر بھی حدِّ سفر نگاہ میں ہے

دھوپ میں اس لیے کھڑا ہوں میں
کوئی سایہ مری پناہ میں ہے

میں اکیلا نہیں اسیرِ بتاں
سارا عالم اسی گناہ میں ہے

عشق میں جو سکون ہے ، صاحب
کیا کسی اور بارگاہ میں ہے؟

سانس لیتی ہیں میری امیدیں
کوئی جگنو شبِ سیاہ میں ہے

اپنی ہستی پہ اعتبار نہیں
یہ جہاں قیدِ اشتباہ میں ہے

اس لیے ہوں شکست سے دوچار
کوئی منکر مری سپاہ میں ہے

اب تو سایہ بھی مجھ کو چھوڑ گیا
زندگی عرصۂ سیاہ میں ہے

◎

شجر اظہار کرتا ہے اگرچہ بے زباں ہے
مرے گھر آنے والے سب پرندوں کا بیاں ہے

وہیں پر دشت ہوتا ہے دریدہ سر جہاں ہوں
ادھر آؤ کہ وحشی قیس کا کنبہ یہاں ہے

عدم کوئی نہیں بس دائرہ ہے زندگی کا
مرے پیچھے جہاں ہے اک مرے آگے جہاں ہے

مکان و وقت ، ہر شے پر اسی کی حکمرانی
جہانِ ہست سارا ہی بشرطِ کن فکاں ہے

مجھے لکھنے سے پہلے بھی بہت سوچا گیا تھا
ابھی بھی آسمانوں پر مرا ذکر و بیاں ہے

میں اپنی داستاں کو چھوڑ کر جنت سے نکلا
ابھی تک اک شجر پر میرے ہاتھوں کا نشاں ہے

ہماری زیست ہے مرگِ مسلسل کا تسلسل
کئی افسانچوں کی اک منظم داستاں ہے

بہت سے سین فلمائے گئے ہیں اس جگہ پر
یہ دل زندہ حویلی تھی جو اب خالی مکاں ہے

فقط ہیئت میں تبدیلی ہے دستور اس جہاں کا
ازل سے یہ زمیں ہے ناں ازل سے آسماں ہے

خیالِ عشق کیسے آ گیا ہے تیرے دل میں
میاں یہ عشق ہے اور عشق تو کوہِ گراں ہے

◎

عشق میں خود کو انا گیر نہیں ہونے دیا
یہ بھی سچ ہے اسے زنجیر نہیں ہونے دیا

دیکھ کر وہ مجھے پتھر کی طرح ہو جاتا
میں نے اسکو کبھی تصویر نہیں ہونے دیا

ہر نیا خواب پرانے کو بدل دیتا ہے
خواب نے خواب کو تعبیر نہیں ہونے دیا

وہ تجھے کاٹتی یا میری تباہی لاتی
سوچ کو صورتِ شمشیر نہیں ہونے دیا

اپنی دیوار کے سائے میں پڑا رہتا ہوں
ہجر کو بھی کبھی تعزیر نہیں ہونے دیا

تجھ کو چاہا ہے مگر تیری غلامی نہیں کی
میں نے دل کو تری جاگیر نہیں ہونے دیا

دنیاداروں نے چڑھائی تو بہت کی احمدؔ
قیس نے دشت کو تسخیر نہیں ہونے دیا

◎

کسی کی سود کسی کی زیاں ضرورت ہے
جہانِ خاک میں میری کہاں ضرورت ہے

تو میرا عشق ہے اور عشق زندگانی کی
بصورتِ رگِ جاں، میری جاں ضرورت ہے

شبِ سیاہ سے مشروط ہے طلوعِ سحر
مرے یقین کی وہم وگماں ضرورت ہے

مرا وجود ہی دار و رسن ہے میرے لیے
کسی صلیب کی مجھ کو کہاں ضرورت ہے

تری طلب کا عمل غیر فطرتی تو نہیں
ہر اک زمین کی اک آسماں ضرورت ہے

میں تیری دسترس و اختیار میں ہوں فقط
وہیں پہ رکھ مجھے تیری جہاں ضرورت ہے

میں کس دیارِ عجم میں نکل گیا احمدؔ
ہر ایک شخص کی یاں پر زباں ضرورت ہے

◎

ہم اہلِ صدق و صفا انتہا کا سوچتے ہیں
قضا کے آنے سے پہلے قضا کا سوچتے ہیں

قدم قدم پہ تقاضا قدم قدم مشروط
خرد شناس ازل سے بلا کا سوچتے ہیں

جب اور کوئی ہمیں تھامنے نہیں آتا
فلک کو دیکھتے ہیں اور خدا کا سوچتے ہیں

ہم اہلِ عشق تضادات کا شکار ہوئے
اسیر ہوتے ہوئے بھی انا کا سوچتے ہیں

جو ہم سے بن سکا ہم نے وہ سب کیا احمدؔ
اب اس سے آگے دعا ہے، دعا کا سوچتے ہیں

◎

تمہاری یادوں کے پھول اب بھی مرے چمن میں مہک رہے ہیں
جو زخم تم نے عطا کیے تھے وہ زخم اب بھی ہرے بھرے ہیں

تمہیں خبر کیا کہ کس طرح سے ہمیں گزارا ہے زندگی نے
نہ بیٹھ پائے نہ چل سکے ہم جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے ہیں

یہ جستجو بھی عجیب شے ہے ہر اک طرف سے پکارتی ہے
ہم اس کے ہاتھوں سے تنگ آ کر تمہارے پہلو سے آ لگے ہیں

میں کس طرح سے سناؤں تجھ کو دلِ حزیں کا وہ قصۂ غم
کہ جس کو سن کر وفورِ غم سے قدیم پتھر بھی رو پڑے ہیں

سنہری زلفوں کی چھاؤں ہم کو عزیز تر تھی عزیز تر ہے
مگر مقدر کی دھوپ میں ہم پڑے سلیقے سے جل بجھے ہیں

مجھے کسی نے پکارنا تھا مگر پکارا نہیں گیا میں
میں سوچتا ہوں کہ لوگ اپنوں کے نام کیسے پکارتے ہیں

کہاں کسی کو خوشی میّسر یہ سب دکھاوے ہیں رونقوں کے
مجھے یقیں ہے کہ لوگ ایسے ہی زندگی کو گزارتے ہیں

کوئی بتائے رہِ وفا میں جو بے گناہی میں مارے جائیں
اگر انہیں قرض اتارنا ہو تو قرض کیسے اتارتے ہیں

◎

برائے تجربہ ایسی خدائی دے مجھ کو
میں جیسے چاہوں یہ دنیا دکھائی دے مجھ کو

مرے ہنر کو اگر آزمانا چاہتا ہے
اسیر کرنے سے پہلے رہائی دے مجھ کو

ندائے حشر سے پہلے یہ آرزو ہے مری
صدائے کون و مکاں بھی سنائی دے مجھ کو

چہار سمت معائب تلاش کرتا ہوں
کبھی تو اپنا گریباں دکھائی دے مجھ کو

جہاں پہ تیرے کرم کی گھٹا برستی ہے
اسی دیارِ حسیں تک رسائی دے مجھ کو

◎

جھلس کے راکھ ہوا آگ کی عبادت کی
عذاب سہنے کی میں نے بڑی ریاضت کی

تمام عمر میں جس خوف سے لرزتا رہا
تمام عمر اسی خوف سے محبت کی

میں اپنی موت کو اپنا حریف جانتا تھا
اسی نے آج مری روح کی حفاظت کی

یقین آنے سے پہلے یقین آنے تک
بڑے وثوق سے میں نے تری وکالت کی

خدائے کبریہ کم ہے کہ خاک ہوتے ہوئے
تری زمین پہ میں نے تری نیابت کی

میں اپنے گھر سے ہی اتنی اٹھا کے لایا ہوں
طلب نہیں رہی مجھ کو کبھی شرافت کی

لہو سے اٹھنے لگی ہے صدائے کن فیکون
یہ کس فقیر نے آ کر مری عیادت کی

◎

ایسا احساسِ ندامت ہے کہ سر اٹھتا نہیں
دل میں انجام کا بیٹھا ہوا ڈر اٹھتا نہیں

یہ حقیقت ہے جو اک بار نظر سے گر جائے
آخری سانس تلک بارِ دِگر اٹھتا نہیں

کارِ ہجرت بھی تو سر کار نہیں ہے بس میں
اب تو مجھ سے مرا سامانِ سفر اٹھتا نہیں

میرے اندر بھی ریاکار چھپا بیٹھا ہے
اشک بہتے ہیں مگر دردِ جگر اٹھتا نہیں

سن کے مظلوم کی فریاد درونِ خانہ
کروٹیں لیتا ہے انسان مگر اٹھتا نہیں

یوں پڑا ہوں ترے رستے میں بقولِ شاعر
سنگ ہے کوئی سرِ راہگذر اٹھتا نہیں

◎

اپنے انجام کو اک دھار پہ رکھ چھوڑا ہے
میں نے سر کو تری تلوار پہ رکھ چھوڑا ہے

جانتا ہوں کہ ہوا کیا کرے گی اس سے سلوک
آخری دیپ بھی دیوار پہ رکھ چھوڑا ہے

چھوڑ کر بے سر و ساماں وہ کدھر جائے گا
جس نے سب کچھ ہی درِ یار پہ رکھ چھوڑا ہے

پہلے خاموشی مری باعثِ ناکامی تھی
اب یہ الزام بھی اظہار پہ رکھ چھوڑا ہے

عشق کی دنیا الگ اور مشیّت بھی الگ
کارِ وحشت دلِ بیزار پہ رکھ چھوڑا ہے

اس کو دیکھا نہیں پر اس پہ یقیں ہے احمدؔ
میں نے تسلیم کو انکار پہ رکھ چھوڑا ہے

◎

ملا رکھا ہے میں نے یوں زمین و آسماں کو
یقیں کے ساتھ پیوستہ کیا وہم وگماں کو

میں اپنی آنکھ کی وسعت بڑھانا چاہتا ہوں
ملائے جا رہا ہوں میں ''یہاں'' کو اور ''وہاں'' کو

مکان و وقت کی بندش بگڑتی جا رہی ہے
بصد حسرت میں دیکھے جا رہا ہوں اس جہاں کو

دیارِ قیس میں گریہ سرائی ہو رہی ہے
کوئی سنتا نہیں ہے دشت کی آہ وفغاں کو

کوئی تو ہے جو میرے اور اس کے درمیاں ہے
اگر یہ خاک ہے تو توڑ دے اس خاکداں کو

◎

کچھ تو حجابِ جلوۂ حسن و جمال رکھ
اے دل وصالِ یار کا کچھ تو خیال رکھ

کچھ اور تو نہ کر سکا تُو اے دلِ نحیف
اپنے لہو کو اپنی رگوں میں اچھال رکھ

مانا کہ تجھ سے ترکِ تعلق ہوا ضرور
پھر بھی کوئی تو رابطہ ہم سے بحال رکھ

دیوار جس کو سنتے ہی ہو جائے منہدم
دنیا کے سامنے کوئی ایسا سوال رکھ

آدابِ وصل یار سے واقف نہیں ہوں میں
کچھ دیر کے لیے مرے مرنے کو ٹال رکھ

جگنو تری تلاش میں آئیں گے دشت سے
اپنے وجود میں کوئی وحشت سی پال رکھ

مرنے کے بعد دنیا تجھے یاد تو کرے
کوئی تو اپنی ذات میں ایسا کمال رکھ

موسم کبھی تو آئیں گے تعبیر کے ضرور
کچھ خواب اپنی آنکھ میں تُو بھی سنبھال رکھ

اب عشق میں ریاضتیں ہونے لگیں شمار
پلکوں سے جو چُنے تھے وہ کانٹے نکال رکھ

◎

کہیں قندیل یادوں کی جلی ہے
بدن مہکا ہے دل میں روشنی ہے

مرا تیرے علاوہ اور ہے کون
تجھی سے دوستی اور دشمنی ہے

میں کیسی بے حسی میں جی رہا ہوں
خداوندا! یہ کیسی آگہی ہے

کوئی احساس بوئے تو کہاں پر
زمیں کی گود پتھر ہوگئی ہے

مجھے پھر خاک میں رکھنے لگے ہیں
مجھے پھر سے سزا ہونے لگی ہے

چراغِ زیست بجھنے کو ہے احمدؔ
ہوا دستک پہ دستک دے رہی ہے

◎

رقص کرتے ہوئے جنگل میں غزالوں کی طرح
تو مرے دل میں اترتا ہے خیالوں کی طرح

سوچ کر تجھ کو جلاتا ہوں میں رستوں کے چراغ
تُو مرے سامنے رہتا ہے مثالوں کی طرح

دم بدم گرتی رہی میرے بدن کی دیوار
چاہِ ماضی میں اترتے ہوئے سالوں کی طرح

کس طرح کی ہوگئی ہے مرے شہروں کی فضا
ہر نیا لمحہ اترتا ہے وبالوں کی طرح

جب بھی احباب کے مابین چلی حسن کی بات
پھر ترا نام ہی آتا ہے حوالوں کی طرح

کوئی مہتاب ضیا بار ہوا ہے مجھ میں
خاک ہو کر بھی فروزاں ہوں اجالوں کی طرح

◎

غرورِ ذات میں اندھے ہوئے ہیں
وگرنہ لوگ ہم سلجھے ہوئے ہیں

یہاں کوتاہ قد لوگوں نے اپنے
سروں پر آسماں باندھے ہوئے ہیں

ہماری دھوپ کے باعث یہاں پر
ہر اک دیوار کے سائے ہوئے ہیں

تمہارے گیسوؤں کے استعارے
ہماری روح سے لپٹے ہوئے ہیں

کئی منہ زور اندھی آرزوئیں
ہمارا راستہ روکے ہوئے ہیں

ادا کر کے کئی کردار ہم لوگ
تمہاری داستاں پہنے ہوئے ہیں

سفر رکتا نہیں یاں پر بجز موت
ہزاروں راستے بکھرے ہوئے ہیں

◎

بھنور میں ڈوبا تو ساحل پہ جا کے نکلا تھا
میں اپنے خواب کو کشتی بنا کے نکلا تھا

جہانِ عشق کا نقشہ بدل گیا مجھ سے
میں سارے دشت کو سر پر اٹھا کے نکلا تھا

اسی لئے تو وہ اب تک تری گرفت میں ہے
ترے بدن سے جو دامن بچا کے نکلا تھا

کوئی شناخت نہ پہچان چاہیے تھی مجھے
فصیل اپنی انا کی گرا کے نکلا تھا

نکل تو آیا تھا میں آسمان سے لیکن
کسی وجود سے پردہ ہٹا کے نکلا تھا

میں اس لئے بھی اسے بے وفا نہیں کہتا
بچھڑتے وقت وہ آنسو بہا کے نکلا تھا

◎

یہ لفظوں میں بیاں ہوتی کہاں ہے
محبت کی زباں ہوتی کہاں ہے

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تنہا
تہجد کی اذاں ہوتی کہاں ہے

بڑا عرصہ ہوا ہے اس کو دیکھے
وہ زیبِ داستاں ہوتی کہاں ہے

حیاتِ جاوداں کہتے ہیں جس کو
وہ زیرِ آسماں ہوتی کہاں ہے

ہمارا آسماں بنجر ہے احمدؔ
یہاں پر کہکشاں ہوتی کہاں ہے

◎

زندگی کو کبھی اچھا کبھی بہتر کرنا
اپنا تو کام ہے مٹی کو برابر کرنا

وہ ملے تو مری تصویر دکھانا اسکو
عشق کے سارے خدوخال اجاگر کرنا

رستہ روکے ہوئے ہر شخص کھڑا ہے یاں پر
جو بھی کرنا ہے تجھے آنکھ بچا کر کرنا

عشق کے کھیل میں انسان بکھر جاتا ہے
عشق کا فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر کرنا

میں تو اک اشک ندامت کا لیے پھرتا ہوں
اسکی قدرت میں ہے قطرے کو سمندر کرنا

مقصدِ شعر وسخن اپنا یہی ہے احمدؔ
فکر کی شمع خیالوں میں منوّر کرنا

◎

جب مری لاش کو اس خاک میں رکھا جائے
میرے کردار کی پوشاک میں رکھا جائے

جب تلک میں کسی تعبیر میں نہ ڈھل جاؤں
مجھ کو اک دیدۂ نمناک میں رکھا جائے

یاد کرتے ہوئے تقسیم نہ کرنا مجھ کو
میرے ہر نقش کو ادراک میں رکھا جائے

پہلے اپنے ہی گریباں کو کیا جائے چاک
اور پھر اسکو کسی چاک میں رکھا جائے

دل چراغِ درِ احساس ہوا رہتا ہے
اس دِیے کو بھی کسی طاق میں رکھا جائے

◎

عشق اپنے حسن کی تسخیر تک زندہ رہا
خواب جیسے خواب کی تعبیر تک زندہ رہا

میری ہستی تو کسی ادراک کا حصہ نہ تھی
میں تو بس اک خاک کی تصویر تک زندہ رہا

عشق کو سنجیدگی سے تو کبھی سوچا نہ تھا
اس لیے یہ مسئلہ تاخیر تک زندہ رہا

باپ کا دیوار سے اونچا نہیں تھا حوصلہ
صحن میں دیوار کی تعمیر تک زندہ رہا

مر گیا میں جب جہاں پر کچھ عیاں ہونے لگا
راز تھا میں راز کی تشہیر تک زندہ رہا

میری ماں نے اک دعا لکھی تھی میرے ہاتھ پر
میں اسی تعویذ کی تاثیر تک زندہ رہا

◎

بگولے راہ پر چلنے لگے ہیں
اسی ڈر سے شجر چلنے لگے ہیں

یہ کیسی ہجرتیں ہونے لگیں اب
یہاں دیوار و در چلنے لگے ہیں

نظر کب تک تعاقب میں رہے گی
مناظر ہی اگر چلنے لگے ہیں

درندے بھی ہمارے راستوں پر
بلا خوف و خطر چلنے لگے ہیں

ہمیں اب آخری ہجرت ہے درپیش
اِدھر سے اب ادھر چلنے لگے ہیں

کسی موہوم سی منزل کے پیچھے
مسافر بے خبر چلنے لگے ہیں

◎

کہانی میں کوئی ایسا بھی لمحہ آنے والا ہے
کہ میری روح کو جگنے پرندہ آنے والا ہے

یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ کوفے میں نکل آئے
مگر ہم نے تو سوچا تھا مدینہ آنے والا ہے

اسی امیّد سے زخموں پہ مرہم بھی نہیں رکھا
فلک کی اور سے کوئی مسیحا آنے والا ہے

سفر میں پیاس کی شیرازہ بندی کر رہا ہوں میں
مجھے معلوم ہے رستے میں دریا آنے والا ہے

تھکے ہارے مسافر راستے میں بیٹھ جاتے ہیں
اگرچہ جانتے ہیں وہ بلاوا آنے والا ہے

◎

بکھرنے کو ہے اک ٹوٹا ہوا شخص
تمہاری راہ میں رکھا ہوا شخص

مری چاہت میں ڈھلتا کیوں نہیں ہے
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہوا شخص

وہ ہم سے راہداری مانگتا ہے
ہماری روح میں اترا ہوا شخص

مری حالت پہ ہنستا جا رہا ہے
زمانے بھر کا دھتکارا ہوا شخص

ہمیں کیا دھوپ سے لڑنا سکھاتا
کسی کی چھاؤں میں بیٹھا ہوا شخص

مسلسل بال نوچے جا رہا ہے
فلک کی اور سے اترا ہوا شخص

◎

اک جنوں ساز جانکاری ہے
عشق تو موت سے بھی بھاری ہے

کیا مجھے اہلِ دل بتائیں گے
کون سا عشق اختیاری ہے

جب تلک حسن جلوہ گر ہے یہاں
عشق کا سلسلہ بھی جاری ہے

آئنہ ہی خلاف ہے ورنہ
تیری جانب تو دنیا ساری ہے

بندگی کے بنا حقیقت میں
سانس لینا بھی شرمساری ہے

شہر جنگل میں ڈھل گیا احمدؔ
ہر طرف ایک خوف طاری ہے

◎

قیامِ کون و مکاں بھی عجب فسانہ ہے
کسی بڑے کی محبت کا شاخسانہ ہے

جب اپنی خاک میں اترا تو میں یہ بھول گیا
کسے نگاہ میں رکھنا کسے بھلانا ہے

مدارِ عشق میں داخل ہوا تو جان گیا
یہاں کی دنیا الگ ہے الگ زمانہ ہے

مرا وجود فلک نے زمیں پہ پھینک دیا
جہانِ خاک خطاؤں کا تازیانہ ہے

اب اختتام ہوا چاہتا ہے سانسوں کا
سریرِ خاک مرا آخری ٹھکانہ ہے

◎

ہر سوچ کے ہمراہ مقدر نہیں آتا
اس واسطے سوچا ہوا منظر نہیں آتا

دشمن پہ میں تلوار بھلا کیسے اٹھاؤں
کوئی بھی مرے قد کے برابر نہیں آتا

ہر لمحہ بدل جاتی ہے اس شہر کی ہیئت
جو گھر سے نکل جائے تو پھر گھر نہیں آتا

بے کار میں تو عدل کی زنجیر کو مت کھینچ
اس شہر میں انصاف میّسر نہیں آتا

یہ سوچتا رہتا ہے پرندہ بھی قفس میں
کیوں ٹھہرے ہوئے وقت کو چکر نہیں آتا

یہ وقت غنیمت ہے گلے اسکو لگالے
ہر روز سنور کر تو مقدر نہیں آتا

ماؤں کے جگر گوشے لہو رنگ ہوئے ہیں
اس دور کے حاکم کو ذرا ڈر نہیں آتا

◎

دستکیں نوحہ کناں ہیں اسی آزار کے بیچ
کوئی در ہے نہ دریچہ کسی دیوار کے بیچ

میں کسی بات پہ سمجھوتا نہیں کر پاتا
اک یہی بات بُری ہے مرے کردار کے بیچ

تو نے دیکھی ہی نہیں غیر یقینی کی فضا
دیکھ سنّاٹا ہے طاری بھرے بازار کے بیچ

چھاؤں میں بیٹھ کے سایہ زدہ ہو جاتے ہیں
کوئی آسیب اتر آیا ہے اشجار کے بیچ

منہجِ تختِ شہنشاہی ترا کیا ہوگا؟
فاصلے مٹنے لگے تختہ و دستار کے بیچ

میں تو بے کار زمانے کا سند یافتہ ہوں
تو بھی بے کار پڑا ہے مرے پندار کے بیچ

ایک دیوار کی سرگوشی مجھے مار گئی
تو بھی آئے گا کسی دن اسی دیوار کے بیچ

◎

طرز ہائے فکر میں ہم کس جہاں کے لوگ ہیں
مختلف ہم سے زمین و آسماں کے لوگ ہیں

دل کشادہ، صاف چہرے، اجلی سوچوں کے امیں
یہ کبھی دیکھے نہیں ہیں یہ کہاں کے لوگ ہیں

عاشقی بھی تو ہمارا اک حوالہ ہے میاں
ہم موحّد ہیں مگر شہرِ بتاں کے لوگ ہیں

فلسفہ تشکیک کا ہم نے کیا ہے زیبِ تن
خواہشوں کے درمیاں وہم و گماں کے لوگ ہیں

روشنی کی بے کلی سے باخبر رہتے ہیں ہم
ہم ستاروں کے مسافر کہکشاں کے لوگ ہیں

◎

اس سے پہلے کہ غمِ عشق دو بالا ہو جائے
یہی بہتر ہے کوئی اس کا ازالہ ہو جائے

تجھ کو دیکھے نہ کوئی میرے علاوہ ہرگز
میری بینائی ترے حسن کا ہالہ ہو جائے

کاش مہتاب مرے دل میں اتر آئے کوئی
کاش میرے بھی رگ و پے میں اجالا ہو جائے

جس سیاہی نے در و بام اجالے ہیں مرے
چاند بھی اس کو اگر دیکھے تو کالا ہو جائے

میں ہمیشہ ترے سائے کی طرح ساتھ رہوں
میری پہچان فقط تیرا حوالہ ہو جائے

◎

مری تقسیم کی جانب سفر ہونے لگا ہے
مکانوں کے حوالے میرا گھر ہونے لگا ہے

دیارِ قیس بھی دستک طلب ہے دیکھئے تو
ہمارا دشت بھی دیوار و در ہونے لگا ہے

ہماری زندگی کا اختتامی رقص دیکھو
بدن کی کانپتی دیوار پر ہونے لگا ہے

یہ کیسے پھول کھلنے لگ گئے ہیں میرے اندر
نظر کا زخم اب زخمِ جگر ہونے لگا ہے

جو گریہ قریہء خاموش میں مرقد نشاں تھا
وہ گریہ شہر میں اب دربدر ہونے لگا ہے

نجانے پڑھ لیا ہے کونسا اس نے صحیفہ
مرے لفظوں کا جادو بے اثر ہونے لگا ہے

مرے دل کی ریاست میں بغاوت ہے یہ کیسی
رگوں میں ہر طرف ہی شور و شر ہونے لگا ہے

◎

پیر و مرشد کوئی ملتا تو بدل جاتا میں
حیطۂ خوف کے چنگل سے نکل جاتا میں

میں فقط اپنے بھروسے سے ہوا ہوں گھائل
تو مرا دوست نہ ہوتا تو سنبھل جاتا میں

تو اگر مجھ سے کبھی کوئی تقاضا کرتا
بخدا ایک اشارے پہ بدل جاتا میں

میں ترے شہر میں آ کر بڑا پچھتایا ہوں
اس سے بہتر تھا کہ جنگل میں نکل جاتا میں

پہلے میں چاروں طرف عشق جلاتا احمدؔ
پھر اسی آگ کی تحویل میں جل جاتا میں

◎

پڑا ہوں نیم جاں مجھ پر قضا پوری نہیں آتی
قضا کو مانگنے کی بھی دعا پوری نہیں آتی

جو سر کو ڈھانپتا ہوں تو قدم باہر نکلتے ہیں
مجھے تو مفلسی کی بھی ردا پوری نہیں آتی

یہ کیسا حبس طاری ہے کہ گھُٹتا جا رہا ہے دم
یہاں تو سانس لینے کو ہوا پوری نہیں آتی

نئی تہذیب کی قدروں نے ایسی شکل دی مجھ کو
بدن پر اب مرے کوئی قبا پوری نہیں آتی

ہماری خشک سالی اس لئے بیدار رہتی ہے
یہاں پر تو برسنے کو گھٹا پوری نہیں آتی

میں بلّھے کی طرح کیسے محبت کو منا لیتا
مجھے تو ناچنے کی بھی ادا پوری نہیں آتی

◎

میرے جسم میں زہر یہ کیسا پھیلا ہے
جو بھی مجھ کو چھوتا ہے مر جاتا ہے

دیدِ ہوس میں آنکھیں جلتی رہتی ہیں
میری آنکھ کا پانی کتنا پیاسا ہے

ضد کو چھوڑو یاں سے واپس ہو جاؤ
اس سے آگے زور سے دریا بہتا ہے

نیّت ناں ہو تو پھر حیلے لاکھوں ہیں
آنا ہو تو سیدھا سادا رستہ ہے

میں کہتا ہوں آگے آگ ہے مت جاؤ
ہر کوئی مجھ کو پاگل پاگل کہتا ہے

آنکھ جلا دیتی ہے دل کے پنچھی کو
خاک کا اپنا ہی لشکارا ہوتا ہے

◎

پرانے بجھ گئے ہیں سب نیا دیا تلاش کر
جو تیرگی نہ بجھ سکے تو پھر دعا تلاش کر

الٹ رہا ہے آسماں پلٹ رہی ہے یہ زمیں
اب اپنے رہنے کے لئے کوئی خلا تلاش کر

میں سیدھا سادا آدمی فریب سے الگ تھلگ
تجھے پسند حیرتیں تو آئنہ تلاش کر

زمانہ اب بدل گیا سنبھل سنبھل کے رکھ قدم
تو زرد زرد چھوڑ دے ہرا ہرا تلاش کر

تو کثرتوں میں غرق ہے میں وحدتوں کا پاسباں
جدا جدا ہیں منزلیں جدا جدا تلاش کر

مری قضا کی فکر میں عبث پڑا ہوا ہے تو
جو تیری اپنی ہے قضا تو وہ قضا تلاش کر

◎

چشمِ بے خواب میں رتجگا رہ گیا
خواب دہلیز پر ہی پڑا رہ گیا

آنکھیں بھر دیں مگر ہاتھ اٹھا رہ گیا
میں سخی کی ادا دیکھتا رہ گیا

وقتِ رخصت سبھی در مقفّل ہوئے
چشمِ بے تاب کا منہ کھلا رہ گیا

حضرتِ عشق سے دوستی کیا ہوئی
دیکھ حالت مری کیا تھا کیا رہ گیا

دشت گردی کے آثار سب مٹ گئے
میرے پاؤں تلے آبلہ رہ گیا

مانگنے کا سلیقہ نہیں تھا مجھے
اس لیے لب پہ حرفِ دعا رہ گیا

◎

صداؤں کو گھٹی سانسوں میں دب کر اب نہیں رہنا
غریبوں کو کمیں گاہوں میں دب کر اب نہیں رہنا

کہا بے باک لہجے میں مجھے نو خیز پودے نے
کہ برگد کی گھنی چھاؤں میں دب کر اب نہیں رہنا

یہ پیغامِ الٰہی ہے اسے آزاد ہونا ہے
مساجد اور کلیساؤں میں دب کر اب نہیں رہنا

کٹیں گی شہ رگیں اپنی مگر زندہ رہیں گے ہم
وجودِ ذات کو سانسوں میں دب کر اب نہیں رہنا

لکھا ہے فیصلہ یہ کاتبِ تقدیر نے اب کے
کسانوں کو کسی گاؤں میں دب کر اب نہیں رہنا

تمہاری آنکھ کے پیچھے نئی سازش چمکتی ہے
ہمیں ان ریشمی باہوں میں دب کر اب نہیں رہنا

بہت اب ہو چکا چھپنا چھپانا کیا زمانے سے
محبت کو دبے پاؤں میں دب کر اب نہیں رہنا

◎

یہ تماشا بھی تہہِ افلاک ہونا چاہیے
اب یہاں پر ہر گریباں چاک ہونا چاہیے

مصلحت اور بزدلی میں فرق رکھتے ہیں میاں
آدمی کو صاحبِ ادراک ہونا چاہیے

پاک کر دیتی ہے مٹی ہر کسی ناپاک کو
آدمی کی خاک کو پھر خاک ہونا چاہیے

درد کی دولت ملے تو پھر تشکر کے لئے
دیدۂ خوں بار کو نمناک ہونا چاہیے

آخرت میں کامیابی کی یہی ہے اک سند
بس غلامِ سیّدِ لولاکؐ ہونا چاہیے

عاشقی کا قرض بھی ہم دیر تک رکھتے نہیں
اب حسابِ دل لگی بے باک ہونا چاہیے

◎

آئینہ ٹوٹے گا تو عکس کدھر جائے گا
مجھ کو لگتا ہے اسی غم میں وہ مر جائے گا

دل کو مت روک جدھر جاتا ہے جانے دے اسے
اور کچھ ٹھوکریں کھائے گا سدھر جائے گا

تیری آواز پہ مڑ کر نہیں دیکھے گا کوئی
اپنی ہی راہ پہ ہر ایک بشر جائے گا

آدمی نامہ مجھے لکھنا نہیں ہے کیونکہ
جو بھی پڑھ لے گا اسے خوف سے مر جائے گا

آئینہ ایسا دکھاؤں گا کسی روز تجھے
اپنے چہرے کو تُو دیکھے گا تو ڈر جائے گا

اس لئے سود و زیاں میں نہیں الجھا احمدؔ
رائیگاں میری محبت کا سفر جائے گا

◎

مرا سینہ تنا ہے اک تمہارے تیر کی خاطر
جو تم نے کھینچ رکھا ہے مری تقصیر کی خاطر

تخیّل کو جہاں کے کینوس پر مجھ کو لانا ہے
کئی منظر بدلنے ہیں تری تصویر کی خاطر

جلا ڈالا ہے میں نے خواہشوں کو شام ہوتے ہی
منڈیروں کو چمکنا ہے یہاں تنویر کی خاطر

مرے اسلاف کے دیکھے ہوئے خوابوں کا قرضہ ہے
مجھے حد سے گزرنا ہے ابھی تعبیر کی خاطر

مجھے مسمار کرنا ہے تعصب کی فصیلوں کو
محبت کے اصولوں پر نئی تعمیر کی خاطر

◎

جو خود اہلِ نظر تھا اس کو اک منظر بنا ڈالا
کسی بے رحم ساحر نے اسے پتھر بنا ڈالا

بنا تو وہ رہا تھا اک سنہری پاؤں کا خاکہ
فقط دستار کی خاطر اسی کو سر بنا ڈالا

جنوں بھی کیا عجب شے ہے کہ اک پانی کے قطرے نے
حسیں نیلم کے سینے پر نشاں آخر بنا ڈالا

یہ کیسی خانقاہی ہے قدم بوسی کے صدقے میں
جسے چاہا اسی کا آسماں پر گھر بنا ڈالا

میں اتنا خوب کب تھا کہ جہاں میری طرف دیکھے
فقط تیری عنایت نے مجھے محور بنا ڈالا

◎

شبِ سیاہ کو اپنا سراج ڈھونڈنا ہے
حصارِ خوف کا کوئی علاج ڈھونڈنا ہے

میں شہرِ ذات کی گلیوں میں کھو گیا ہوں کہیں
سراغِ راہِ سفر مجھ کو آج ڈھونڈنا ہے

خیالِ یار مجھے چھوڑ نیند کرنے دے
کہ صبح اُٹھ کے مجھے کام کاج ڈھونڈنا ہے

خراج لینا ہے اپنی صلاحیت کا مجھے
ابھی تو شعر و سخن کا مزاج ڈھونڈنا ہے

نئی رسوم نے خوشیوں میں بھر دیا ہے زہر
گئی رتوں سے پرانا رواج ڈھونڈنا ہے

قیامِ سلطنتِ عالی مرتبت کے لئے
نیا علاقہ نیا اک سماج ڈھونڈنا ہے

◎

دلِ بیزار سے بیزار ہوا رہتا ہوں
مجھ سے میں برسرِ پیکار ہوا رہتا ہوں

اب کسی کو بھی شکایت نہیں ہوگی مجھ سے
اپنے ہی سامنے دیوار ہوا رہتا ہوں

اتنا مشکل تو نہیں پھر بھی نجانے کیوں کر
ہر کسی کے لیے دشوار ہوا رہتا ہوں

اب تری ذات سے کیا ہے مجھے لینا دینا
بس تجھے سوچ کے سرشار ہوا رہتا ہوں

یہ سفر کیسے کٹے گا مجھے معلوم نہیں
نت نئی راہوں سے دو چار ہوا رہتا ہوں

کون آئے گا مرے ناز اٹھانے احمدؔ
میں ہمہ وقت گراں بار ہوا رہتا ہوں

◎

بے غرض اور وفادار پرندوں جیسا
تم سے کرتا ہے کوئی پیار پرندوں جیسا

میں ترے ہجر میں رو رو کے فنا ہو جاتا
میں اگر ہوتا عزادار پرندوں جیسا

آب و دانے پہ قناعت نہیں کرتا کوئی
کوئی ہوتا نہیں سرکار پرندوں جیسا

ہم تو بے پر کی اڑاتے ہیں جہاں جاتے ہیں
ہم سے ہوتا نہیں اظہار پرندوں جیسا

لکھنے والے نے کہانی میں مکلّف لکھا
کاش لکھتا مرا کردار پرندوں جیسا

میں کبوتر کی سی معکوس اڑانیں اڑتا
تو مجھے کہتا جو اک بار پرندوں جیسا

امن ہوتا یہاں اشجار سلامت رہتے
ہم کو ملتا کوئی سالار پرندوں جیسا

◎

یہ ایک بار نہیں بار بار ہوتا رہا
لباسِ زیست مرا تار تار ہوتا رہا

کبھی احاطۂ ادراک میں نہیں آیا
عجائباتِ جہاں میں شمار ہوتا رہا

تو کب کی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی
مگر اے دنیا ترا اعتبار ہوتا رہا

وفا، نفاق و ہوس کے بدل میں بکتی رہی
بنامِ عشق یہی کاروبار ہوتا رہا

مری کہانی وصال و فراق کا پرتَو
میں بار بار یہاں اشکبار ہوتا رہا

عجب سماں تھا کہ تقریبِ جانکنی کے سمے
تمہارے آنے کا بس انتظار ہوتا رہا

◎

جس طرح اس نے چاہا میں ویسا بدل گیا
پھر دفعتاً ہی اُس کا تقاضا بدل گیا

اک لمحے کو رکا تھا اشارے پہ آ کے وہ
میں نے جو اُس کو دیکھا اشارا بدل گیا

اب روشنی ہی روشنی مجھ کو دکھائی دے
وہ شخص میری آنکھ کی دنیا بدل گیا

سوچا تھا وجہِ ترکِ تعلق ہی پوچھ لیں
لیکن وہ دیکھ کر ہمیں رستہ بدل گیا

اب جس طرح کی ہونے لگی ہیں ہلاکتیں
لگتا ہے موت کا بھی فرشتہ بدل گیا

ہم نے تو ایک لفظ بھی اُس سے نہیں کہا
بس آئنے کو دیکھا تو چہرہ بدل گیا

یوں پھر رہی ہے زندگی موجِ گمان میں
جیسے کہ اس کا موت سے رشتہ بدل گیا

◎

جب زمیں پر مرا قیام ہوا
عرصۂ ہجر میرے نام ہوا

عشق کی آگ کے سلگنے کا
ہجر سے سارا اہتمام ہوا

بس ادھوری سی اک محبت کی
اک یہی بس ادھورا کام ہوا

زندگی ایسے ہی بسر کر دی
کچھ نہ جینے کا التزام ہوا

عین اس وقت وہ کھلا مجھ پر
زندگی کا جب اختتام ہوا

◎

مجھ میں رفاقتوں کا وہ جوہر نہیں رہا
اس واسطے کوئی بھی میّسر نہیں رہا

جو شخص تیری ذات کو محبوب تھا بہت
وہ شخص بھی تو اب مرے اندر نہیں رہا

حالات کی ستم گری تو دیکھئے حضور
آنکھیں ملیں مجھے تو وہ منظر نہیں رہا

اس واسطے بھی میں نے یہ تلوار پھینک دی
دشمن بھی کوئی میرے برابر نہیں رہا

کل رات اس کی آنکھ سے آنسو چھلک پڑے
ایسے لگا مجھے کہ وہ پتھر نہیں رہا

اس نامراد کو تجھے کیسے میں سونپتا
یہ دل تو میرے حق میں بھی بہتر نہیں رہا

◎

جب سے سیکھا ضبط کرنا میں ٹھکانے لگ گیا
میرا اپنا درد مجھ سے منہ چھپانے لگ گیا

زندگی سے واپسی کا جب سفر ہونے لگا
خواہشوں کے بت کدے کو میں گرانے لگ گیا

یاد کی اک پھلجھڑی ایسی گلی میں لے گئی
اک محلہ میرے اندر کسمسانے لگ گیا

ہجر کے لمحات کا اس نے کیا یوں تذکرہ
دل پرندہ ہجر مارا پھڑ پھڑانے لگ گیا

مصلحت کوشی نے مجھ کو جب کیا اپنے قریب
روٹھ کر میرا جنوں پھر خاک اڑانے لگ گیا

دشت کو وحشت سے میری ہوگئی وابستگی
الوداع کہتے ہوئے آنسو بہانے لگ گیا

◎

دل کے جو منطقے میں آتا ہے
ریشمی دائرے میں آتا ہے

اس لیے راستے نہیں کٹتے
چاند ہر راستے میں آتا ہے

اصل مفہوم تو وہی ہے جو
معنوی فاصلے میں آتا ہے

منفعت اور زیاں کا قصہ تو
منطقی زاویے میں آتا ہے

اے اجل! انتظار لمحہ بھر
ہمسفر راستے میں آتا ہے

◎

اپنے ہاتھوں سے تجھے خود سے جدا کرتے ہیں
عشق کی قید سے جا ، تجھ کو رِہا کرتے ہیں

مر تو جاتے ہیں پہ اظہار نہیں کر پاتے
ہم انا گیر یونہی عشق کیا کرتے ہیں

تم انہیں کوچہ و بازار میں کیوں ڈھونڈتے ہو
خواب تو آنکھ کی دنیا میں رہا کرتے ہیں

ہم کسی پیڑ کا احساں نہیں لیتے سر پر
ہم کڑی دھوپ میں جی بھر کے جلا کرتے ہیں

اپنی پلکوں کو اٹھا دیکھ مری آنکھوں میں
مجھ سے وحشی بھی کبھی دھوکا دیا کرتے ہیں؟

ہم کو جس نام سے تم چاہو پکارو احمدؔ
لوگ ہم جیسوں کو مجذوب کہا کرتے ہیں

◎

مری نگہ کی کہیں خیرگی نہ بڑھ جائے
دعائے خیر کرو روشنی نہ بڑھ جائے

ابھی تلک تو میں یہ بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں
شکستہ کاری تلک عمر ہی نہ بڑھ جائے

کوئی تو ہے جو مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
نہیں تو میری یہ شوریدگی نہ بڑھ جائے

کسی کے لمس نے روکا ہوا ہے مجھ کو میاں
وگرنہ تیری طرف تشنگی نہ بڑھ جائے؟

مجھے یہ خوف ہے کہ تیری سرد مہری سے
مرے وجود کی یخ بستگی نہ بڑھ جائے

سنا ہے واپسی کا راستہ نہیں ملتا
نگاہِ شوخ سے وابستگی نہ بڑھ جائے

میں اس لیے بھی محبت فروغ دیتا ہوں
ترے جہاں میں کہیں بے رخی نہ بڑھ جائے

◎

دشتِ دل میں جنوں کو اتارا گیا
عشق کی مار سے اس کو مارا گیا

اک زمانہ لگا میری تہذیب کو
وقت کے چاک پر میں سنوارا گیا

میں ہی وہ شخص ہوں جس کا چہرہ نہیں
مجھ کو ہر نام سے ہی پکارا گیا

میں وہ مسجود جو معصیت کے سبب
اک کڑے امتحاں سے گزارا گیا

میں ترے ہاتھ میں غیر مشروط تھا
میں چلا جس طرف کو اشارہ گیا

آس باندھے ہوئے میں چلا جس طرف
پیچھے پیچھے ہی میرا خسارہ گیا

مجھ کو مانگا گیا جب ضرورت پڑی
قرض کی طرح مجھ کو اتارا گیا

◎

تمہیں کیا زیب دیتا ہے ہمیں آزار میں رکھنا
اسے دل میں جگہ دینا ہمیں دیوار میں رکھنا

کئی قدروں حوالوں کو زمانہ ترک کر بیٹھا
مگر تم نے نہیں چھوڑا ہمیں انکار میں رکھنا

نظر کے پیش منظر سے وہ منظر ہی نہیں اترا
اٹھا کر اک قیامت سی لب و رخسار میں رکھنا

تمہاری کہکشاں کا میں ستارہ تو نہیں پھر بھی
مجھے اپنی کہانی کے کسی کردار میں رکھنا

سنانا ہی پڑے گا اب تمہیں بھی فیصلہ اپنا
کسے آنکھوں میں رکھنا ہے کسے گفتار میں رکھنا

◎

عجب سفر مرے دامِ خیالِ خام میں تھا
میں چل رہا تھا مگر حالتِ قیام میں تھا

میں لمحہ لمحہ مکمل شمار ہوتا رہا
پسِ نظر کوئی آئینہ صبح و شام میں تھا

عدو کا رستہ اسی واسطے نہیں روکا
معاف کرنا مرے طرزِ انتقام میں تھا

مجھے لگا تھا کہ تقسیم ہو رہا ہوں میں
بکھر رہا تھا مگر صورتِ دوام میں تھا

کوئی تفاوتِ قلب و زباں نہ تھا مجھ میں
وہی مراد تھی دل کی جو کچھ کلام میں تھا

مرا مزاجِ خیال و سُخن بہکنے لگا
عجیب ذائقہ اس لقمۂ حرام میں تھا

میں دیکھتا رہا اس کو نگاہِ حیرت سے
عجیب لطفِ نظر مستیِٔ خرام میں تھا

◎

فقط وہ اک حادثہ ہوا تھا معاف کرنا
میں تری آنکھوں میں کھو گیا تھا معاف کرنا

نجانے کب میں تمہاری دنیا کو چھوڑ جاؤں
جو کچھ بھی میں نے کہا سنا تھا معاف کرنا

مرے مقدر میں سب سے بڑھ کر یہی سزا تھی
میں تیرے پہلو سے آ لگا تھا معاف کرنا

صفِ ندامت بچھی ہوئی تھی اکیلا میں تھا
تمہاری یادوں کا رتجگا تھا معاف کرنا

جو تجھ کو سب سے عزیز تر تھا اسی کے صدقے
اسے، نظر سے جو گر گیا تھا، معاف کرنا

ہم اپنے دشمن کے ڈر سے دونوں ملے ہوئے تھے
ہمارا رستہ جدا جدا تھا معاف کرنا

بچھڑ کے ہم سے گزارنے کا وہ فیصلہ بھی
تمہارا اپنا ہی فیصلہ تھا معاف کرنا

تمہیں بچھڑنے کا اِک بہانہ ہی چاہیے تھا
وہ خیر سے تم کو مل گیا تھا معاف کرنا

◎

جہاں کا آخری مجھ کو کنارا لگتا ہے
یہ ارتقاء تو فنا کا اشارا لگتا ہے

یہ کیسا شور بپا ہے مرے بدن کے بیچ
سکوتِ دھر نے مجھ کو پکارا لگتا ہے

چہار سمت مرے آئنے ہی آئنے ہیں
وجود اپنا ہی سارے کا سارا لگتا ہے

غبارِ خاک زمیں سے بلند ہونے لگا
کسی نے زہر زمیں میں اتارا لگتا ہے

عجیب شخص ہے اندازِ گفتگو سے مجھے
حدیثِ وقت کا تازہ شمارہ لگتا ہے

◎

عکسِ جہاں میں آخری حیرت دکھائیے
اب آئینے کو توڑیئے صورت دکھائیے

ہم سوچتے ہیں مختلف انداز سے حضور
ہم معرفت زدوں کو حقیقت دکھائیے

اٹھیے کہ آفتاب سے کرنیں چھلک پڑیں
اب حسنِ ماہتاب کی غیرت دکھائیے

کب تک انا کے بوجھ کو سر پر اٹھاؤ گے
اس نامراد کو بھی ہزیمت دکھائیے

ہم کاروانِ شعر و سخن کے سفیر ہیں
مصرعہ اٹھائیے کوئی ندرت دکھائیے

ہم انتہا پسند ہیں شورش مزاج ہیں
کارِ جنوں ہے عشق تو وحشت دکھائیے

اب عرصۂ حیات بھی ہونے لگا ہے تنگ
اب کاہلی کو چھوڑیئے عجلت دکھائیے

◎

کیا خبر کب کس جگہ پر سانحہ ہو جائے گا
کوئی بچہ پھر کہیں بے آسرا ہو جائے گا

کس تفاخر سے یہ دریا بہہ رہا ہے موج میں
اک سمندر میں کسی دن یہ فنا ہو جائے گا

جس جگہ سے میں چلا تھا اس جگہ پہنچوں گا تو
زندگی کا پھر مکمل دائرہ ہو جائے گا

وہ ہوا ہے درپئے آزار زور و شور سے
لگ رہا ہے پھر حسیں اک واقعہ ہو جائے گا

آنکھ رستے پر ''بریکر'' ''بیرئیر'' ہیں رائیگاں
شاہراہِ دل پہ پھر بھی حادثہ ہو جائے گا

◎

چشمِ تر سے تری امید کا دامن چھوٹا
جیسے بپھرے ہوئے دریا کا کنارا ٹوٹا

اب کہاں خاک اڑانے کے لئے ہم جائیں
لوگ کہتے ہیں کہ صحرا میں بھی چشمہ پھُوٹا

زندگی موت کنارے سے لگی رہتی ہے
اب تو ہر سانس پہ لگتا ہے کہ ٹوٹا ٹوٹا

اب مرے جسم کے اعضا بھی ہیں بدلے بدلے
اب تو یہ دل بھی مجھے لگتا ہے روٹھا روٹھا

یوں ترا پوچھتے ہیں مجھ سے چمن کے باسی
میرے پاؤں سے لپٹ جاتا ہے بوٹا بوٹا

◎

کروٹیں لینے لگا ہجر پرانا اپنا
وحشتیں پوچھتی پھرتی ہیں ٹھکانا اپنا

اپنے لوگوں کا قبیلہ تو فقط عشق ہے عشق
شورشیں ڈھونڈھتا رہتا ہے گھرانہ اپنا

اسی حیرت میں ازل سے ہیں یہ دنیا والے
کس طرح رنگ بدلتا ہے زمانہ اپنا

خرمن ذات تلک آگ نکل آئی ہے
اب تو ممکن نہیں دامن کو بچانا اپنا

میرا کردار کہانی سے نکل جائے گا
پھر یہ اشعار سنائیں گے فسانہ اپنا

اپنے حالات کی تلخی کو مٹانے کے لیے
یاد کرتا ہے ہر اک شخص زمانہ اپنا

اب تو بینائی بھی دھندلانے لگی ہے احمدؔ
اب نشانے پہ لگے کیسے نشانہ اپنا

◎

آدمی کو خاک کے ارکان میں رکھا گیا
ماسوا جو کچھ بھی تھا انسان میں رکھا گیا

زندگی میں تو فقط کچھ راستے رکھے گئے
منزلوں کا سلسلہ امکان میں رکھا گیا

اک کثافت سے ہوئی ہے اک لطافت ہمکنار
روح کا سارا ہنر ابدان میں رکھا گیا

لوحِ انساں پر کوئی تحریر کب لکھی گئی
اک خدا کی ذات کو عرفان میں رکھا گیا

◎

مجھ سے ملنے کا مجھے ایک تو موقع دے دے
اے مرے دل تو مجھے تھوڑا سا رستہ دے دے

کاش ایسی کوئی آواز سنائی دیتی
کاش پانی کبھی کہتا مجھے پیاسا دے دے

اب تو سورج بھی بدن چیر رہا ہے میرا
اب تو سایہ بھی یہ کہتا ہے کہ سایہ دے دے

بھیڑ میں تجھ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی
چند لمحے ہی کسی دن مجھے تنہا دے دے

اِک قناعت مجھے مطلوب ہے تیرے در سے
ایسی دولت مرے من کو مرے مولیٰ دے دے

میں تو باتوں سے بہل جاتا ہوں میرے اپنے
تیرا ملنا جو ہو دشوار تو وعدہ دے دے

◎

کوئی خیال زمیں پر اترنے والا ہے
پھر اس کے بعد زمانہ بدلنے والا ہے

یہ آسماں یہ ستارے کلام کرتے ہیں
نظامِ ہست کسی دن بکھرنے والا ہے

یہ کیسا شور بپا ہے مری رگوں کے بیچ
لہو سے جنگ کا آغاز ہونے والا ہے

اسی لئے کوئی منزل دکھائی دیتی نہیں
خرد کی آنکھ سے کانٹا نکلنے والا ہے

◎

مرے وجود میں اب تک یقیں نہیں اترا
عجب مکاں ہے کہ جس میں مکیں نہیں اترا

مجھے کسی نے فلک سے ابھی پکارا نہیں
اسی لیے تو میں زیرِ زمیں نہیں اترا

بیاضِ چشم کا زندہ کلام پڑھیے گا
زمیں پہ ایسا صحیفہ کہیں نہیں اترا

دل و نگاہ میں آلودگی زیادہ تھی
اسی لئے تو وہ محمل نشیں نہیں اترا

وہ جس کو دیکھ کے بادل برسنے لگتے تھے
دیارِ خاک پہ ایسا حسیں نہیں اترا

وہ ایک چہرہ کہ جس کو کبھی نہیں دیکھا
مرے حواس سے اترا نہیں، نہیں اترا

◎

فصیلِ جسم شکستہ کمان ہوگئی ہے
مرورِ وقت سے عبرت نشان ہوگئی ہے

یہ کیسی بھیڑ ہے دنیا حواس کھونے لگی
قیامِ حشر کی گویا اذان ہوگئی ہے

عدم وجود کا قصہ تو اختتام ہوا
مری کہانی مفصّل بیان ہوگئی ہے

وہ بے حسی جو مری خاک میں بسی ہوئی تھی
وہ میرے ساتھ اب الھّڑ جوان ہوگئی ہے

ثمود و عاد کی حالت کو آگئے ہیں ہم
بظاہر اپنی فلک تک اڑان ہوگئی ہے

فرشتے بسنے لگے ہیں نگر نگر میں یہاں
سنا ہے اپنی زمین آسمان ہوگئی ہے

◎

اپنی تقسیم کا آزار اٹھانے لگا ہوں
جسم اور روح میں دیوار اٹھانے لگا ہوں

مار ڈالے گا کسی دن مجھے اندر کا سکوت
اس لیے سر پہ میں بازار اٹھانے لگا ہوں

کسی طوفاں نے مری سمت بدل ڈالی ہے
اپنے ٹوٹے ہوئے پتوار اٹھانے لگا ہوں

سوچتا ہوں کہ کہانی کو امر کر جاؤں
اس لیے مرکزی کردار اٹھانے لگا ہوں

عمر رفتہ کے سبھی نقش مٹانے کے لیے
اپنے قدموں کے میں آثار اٹھانے لگا ہوں

ایک منکر جو مرے دل میں جما بیٹھا ہے
اس کے پہلو سے میں انکار اٹھانے لگا ہوں

کوئی وحشت ہے جنوں ہے نہ کوئی دشت یہاں
عشق کا بوجھ میں بے کار اٹھانے لگا ہوں

◎

میں زود رنج نہ ہوتا تو ڈر گیا ہوتا
اجل کے آنے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا

میں جاگتے میں ترے خواب دیکھتا رہتا
تو میری آنکھوں میں گر نیند بھر گیا ہوتا

وہ ایک لمحہ مرے فیصلے کا لمحہ تھا
اگر میں پگڑی بچاتا تو سر گیا ہوتا

میں اپنی خاک سمیٹے ہوئے ہوں برسوں سے
کسی کے ہاتھ جو لگتا بکھر گیا ہوتا

میں جانتا تھا کسی ایک کو تو جانا ہے
مکان بیچ نہ دیتا تو گھر گیا ہوتا

کسی غریب کی کٹیا تھی اس کنارے پر
وگرنہ دریا سکوں سے گزر گیا ہوتا

◎

میری آنکھوں کے جو اطراف میں ہالے ہوئے ہیں
یہ ترے بخشے ہوئے خواب سنبھالے ہوئے ہیں

میں نے تو کب سے تہہِ خاک چلے جانا تھا
تیرے وعدے ہی مری موت کو ٹالے ہوئے ہیں

یہ تری یاد کا صدقہ ہے جو میرے اندر
شام ہوتے ہی رگ و پے میں اجالے ہوئے ہیں

دست قدرت نے ترے نام پہ لکھ چھوڑا ہے
خوش نصیبی ہے کہ ہم تیرے حوالے ہوئے ہیں

اے خدا کچھ تو عنایت کی نظر ہو ان پر
کتنے برباد ترے چاہنے والے ہوئے ہیں

ہم کو رسوائی سے کیوں خوف دلاتے ہو میاں
ہم تو پہلے ہی یہاں خاک اچھالے ہوئے ہیں

اپنے چہروں پہ ندامت سی لئے پھرتے ہیں جو
مجھ کو لگتا ہے یہ جنت سے نکالے ہوئے ہیں

◎

بس اِک تلاش تھی مجھے اپنے جہان کی
میں خاک چھانتا رہا کون و مکان کی

تجھ کو خیال ہی نہیں آئندگاں کا دوست
بنیاد رکھ رہا ہے تو کچے مکان کی

اس نے تو میرے جسم کو ملبہ بنا دیا
تعمیر کر رہا تھا میں جس خاندان کی

زیرِ زمیں ابلنے کو چشمہ ہے بے قرار
آواز آ رہی ہے مقدّس چٹان کی

جب آس پاس میں کوئی منظر نہیں بچا
تصویر کھینچنے لگا میں آسمان کی

تو نے تو ساری عمر گزاری زمین پر
کیا قدر ہے تجھے مری اونچی اُڑان کی

◎

نوحہ کرتے ہوئے ہر شخص دہائی دے گا
خواب ٹوٹیں گے تو اک شور سنائی دے گا

اک کنارے کی طرح ساتھ رہے گا میرے
وہ کسی روز مجھے ایسی جدائی دے گا

یہ تو اچھوں کا ہنر ہے کہ برا دیکھ سکیں
میں برا ہوں تو برا کون دکھائی دے گا

اختیار اپنا یونہی کون کسے دیتا ہے
بے غرض کون مجھے اپنی خدائی دے گا

اپنے گنبد میں مقیّد ہوں اس امید کے ساتھ
کوئی رستہ بھی کبھی مجھ کو سجھائی دے گا

کون بولے گا مرے حق میں بلا خوف و خطر
مجھ کو دستار تلک کون رسائی دے گا

◎

یادوں کے چراغوں کو منڈیروں پہ جلا کر
اے دل! تو سرِ شام تماشا نہ کیا کر

بھاگا ہوں لگاتار میں تعبیر کے پیچھے
آنکھوں کے جھروکوں میں کوئی خواب سجا کر

پہلے بھی کہاں اتنی بلندی پہ کھڑا ہوں
کیا تجھ کو ملے گا مجھے نظروں سے گرا کر

رستہ جو نکل آئے تو بہتر ہے وگرنہ
دیوار پہ ماروں گا میں دروازہ اُٹھا کر

وہ بابِ حقیقت تھا، مری آخری حد تھی
گہرائی کو دیکھا بڑی گہرائی میں جا کر

فرہنگِ محبت میں کہاں سود و زیاں دوست
سمجھاؤں گا یہ بات تجھے پاس بٹھا کر

◎

خواہشوں کے جنگل سے زندگی نکل آئے
جسم کی محبت سے آدمی نکل آئے

آپ پر تو تکیہ تھا ناز تھا تعلق پر
میرے دشمنوں میں سے آپ بھی نکل آئے

کس طرح چلے گا پھر زندگی کا کاروبار
جذبۂ جنوں سے گر عاشقی نکل آئے

میرے گھر کی دیواریں عرصۂ سیاہی میں
بین کرتی رہتی ہیں روشنی نکل آئے

قید ہو گیا ہوں میں ضبط کی فصیلوں میں
کاش میری آنکھوں سے اشک ہی نکل آئے

◎

الجھا رہا میں بھیڑ میں رستہ نہ بن سکا
میرا کہیں بھی نقشِ کفِ پا نہ بن سکا

اِک دن وہ میرے ہاتھ سے ایسے گرا کہ بس
پھر میں نے اُس کو لاکھ بنایا نہ بن سکا

لگتا ہے اس نے مجھ کو مکمل نہیں کیا
یا پھر میں اس کے ہاتھ سے پورا نہ بن سکا

اِک عمر سے وہ ساتھ ہے، ہمراز ہے مرا
لیکن مرے وجود کا حصہ نہ بن سکا

اس واسطے بھی اس کو مجھے چھوڑنا پڑا
جس طرح اس نے چاہا میں ویسا نہ بن سکا

سوچا تھا خامشی سے گزاروں گا زندگی
گونگا تو بن گیا تھا میں بہرا نہ بن سکا

اُترا تو تھا وہ مجھ میں مگر روح تک نہیں
اس واسطے وہ میرا مسیحا نہ بن سکا

دریا دلی بہت تھی پہ سرکش نہیں تھا میں
احمدؔ میں اس لئے کبھی دریا نہ بن سکا

◎

سب فنا کا ہے سفر کچھ تو بقا کا سوچیے
فتنۂ لہو و لعب کی انتہا کا سوچیے

ملبۂ وہم و گماں کو پھینکئے پاتال میں
اپنے خالق کی مشیّت اور رضا کا سوچیے

رینگتا رہتا ہے سنّاٹا مری اطراف میں
اسمِ اعظم پھونکئے ردِّ بلا کا سوچیے

طالب و مطلوب خاکی خاک میں مل جائیں گے
وردِ اسمِ احمدِ صلِّ علیٰ کا سوچیے

اب کوئی تدبیر اپنے کام آنے کی نہیں
اک ندامت بھر کے آنکھوں میں دعا کا سوچیے